الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ہر قسم کے فساد کے خلاف سب سے بڑا روک
صرف ایک ہے ——————
اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا

مارچ ۱۹۸۹
شمارہ ۱۴۸

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۸ مارچ ۱۹۸۹

فہرست

	صفحہ		صفحہ
ایک تاثر	۲	ایک مثال	۱۶
اچھا گمان	۳	پانچ دن	۱۷
کائنات کا سبق	۴	یہ انسان	۱۹
قرآن اور عربی زبان	۵	ایک آیت	۲۰
رہبانیت	۷	قول و عمل کا تضاد	۲۱
اپنے خلاف	۸	تقدس کی پامالی	۲۲
مشکل میں آسانی	۹	جرم کی نفسیات	۲۳
نظامِ خداوندی	۱۰	عجیب تضاد	۲۴
حوصلہ	۱۱	سفر نامہ افغانستان	۲۶
سبب اپنے اندر	۱۲	قسط ۔ ۲	
پٹرول کے بغیر	۱۳	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۵
رحم دلِ فاتح	۱۴	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

ایک تاثر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت متقیوں کے لیے ہے (ھدیً للمتقین) زمین سوکھی ہو تبھی اس میں پانی جذب ہوتا ہے، گیلی زمین کبھی پانی کو قبول نہیں کرتی۔ اسی طرح ہدایت بھی صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو ہدایت کا طالب ہو، جو اپنی تلاش کا آدھا راستہ خود طے کر چکا ہو۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی "گیلی زمین" بنا ہوا ہے، کسی کی زمین "سوکھی زمین" نہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کے کھیتوں میں ہدایت کی فصل اُگے تو کس طرح اگے۔ جب لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو کیسے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہاں ایک روشن سورج چمک رہا ہے۔ جب لوگوں نے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہوں تو کیسے ان کو باخبر کیا جائے کہ یہاں ہرے بھرے درخت حمد الٰہی کے نغمے سنا رہے ہیں۔ جب لوگوں نے اپنا رخ ظاہری رونقوں کی طرف موڑ رکھا ہو تو کیسے انھیں آگاہ کیا جائے کہ ان ظواہر کے دوسری طرف ایک اور اتھاہ دنیا ہے جس میں خدا کی ابدی تجلیات اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔

آج کی دنیا میں کوئی بات کہی جائے تو کس کے لیے کہی جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف الفاظ کی زبان سمجھتے ہوں وہاں معانی کی زبان کا نغمہ کس کے لیے چھیڑا جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگوں کو صرف ظاہری حقیقتوں کا پتہ ہو وہاں چھپی ہوئی حقیقتوں کی پردہ دری کی جائے تو کس کے لیے کی جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف شور و غل کو کام سمجھتے ہوں وہاں خاموش منصوبہ کا راز افشاء کیا جائے تو کس انسان کے لیے کیا جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف اپنی ذات کو جانتے ہو وہاں اپنی ذات سے بلند تر حقائق کی پردہ کشائی کی جائے تو کس کے لیے کی جائے۔

آہ وہ دنیا جہاں خدا الگ کھڑا ہوا دیکھ رہا ہو کہ کوئی ہو جو اس کا نغمہ گائے، کوئی ہو جو اس کی حمد کا ترانہ چھیڑے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی شخص بھی خدا کا نغمہ گانے والا نہ ہو۔ جہاں کوئی نہ ہو جو آخرت کی بانسری بجائے، جو فرشتوں کے چھیڑے ہوئے تاروں سے ہم آواز ہو کر حقیقت اعلیٰ کے گیت گائے ——— آج کی دنیا میں انسانوں کے تذکرے ہیں، مگر خدا کا تذکرہ نہیں۔ خدا کے نام پر قیادت کرنے والے بے شمار ہیں مگر خدا کے لیے تڑپنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

اچھا گمان

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا : انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی خیراً (میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں تو بندہ کو چاہیے کہ وہ میرے بارہ میں اچھا گمان کرے) یعنی وہ میرے متعلق حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے احتمالاتِ شر کے مقابلہ میں احتمالاتِ خیر کو ترجیح دے۔

ایک شخص ایک ادارہ میں ملازم تھا۔ اس کو ادارہ کی طرف سے ایک کمرہ دیا گیا۔ اسی کمرہ میں وہ رہتا تھا اور اسی میں بیٹھ کر وہ اپنا دفتری کام بھی کرتا تھا۔ جب اس کی ماہانہ تنخواہ کا چیک آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ دس روپیہ کے بقدر کم ہے۔ اس نے ادارہ کے ناظم سے اس کا سبب پوچھا۔ ناظم نے کہا کہ یہ کمرہ کی بجلی کا چارج ہے جو تمہاری تنخواہ سے وضع کیا گیا ہے۔ آدمی نے کہا کہ میں جس کمرہ میں رہتا ہوں وہی میرا دفتر بھی ہے۔ ایسی حالت میں بجلی کا خرچ دفتر کے حساب میں جانا چاہیے۔ ناظم نے جواب دیا : تمہارا کمرہ دفتر بھی ہے اور رہائش بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس کو کس کے تابع کیا جائے۔ تم چاہتے ہو کہ رہائش دفتر کے تابع رہے، ہم نے اس کے برعکس دفتر کو رہائش کے تابع کیا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ مذکورہ حدیث کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان تنگ دل ہے۔ اس نے بے رحمی کا معاملہ کرتے ہوئے اپنے کارکن کے موافق پہلو کو اس کے غیر موافق پہلو کے تابع کر دیا خدا ارحم الراحمین ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ وہ اس کی شانِ کریمی سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کے غیر موافق پہلو کو اس کے موافق پہلو کے تابع کر دے گا، اور آخرت میں اس کے ساتھ وہ فیصلہ فرمائے گا جو اس کے حق میں زیادہ بہتر اور زیادہ آسان ہو۔

بندہ کو امید رکھنا چاہیے کہ قیامت میں اس کا رب اس کے بارے میں کہدے کہ یہ قابلِ سزا نہیں، قابلِ درگذر ہے۔ وہ اس کی غلطی کو عجز پر محمول کر کے چھوڑ دے گا نہ کہ اس کو سرکشی پر محمول کر کے اسے سزا دے۔ وہ گمان کرے کہ بندہ کے پاس اگر حسنِ عمل کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اس کے بقیہ اعمال نامہ کو اسی ذرہ کے تابع کر دے گا نہ کہ ذرہ کو بقیہ اعمال نامہ کے تابع بنا دے۔

کائنات کا سبق

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان خدا کی حمد کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اور اس کے کلمات کو نمایاں کر رہے ہیں۔ یہ انتظام اس لیے ہے تاکہ انسان ان سے سبق لے، تاکہ وہ اپنے آپ کو کائناتی قافلہ کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔

زمین و آسمان کس زبان میں خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ چپ کی زبان میں۔ خدا اپنی کائنات میں چپ کی زبان میں بول رہا ہے۔ وہ واقعات کی زبان میں ہم سے ہم کلام ہے۔ اب جو لوگ صرف شور کی زبان سننا جانتے ہوں، وہ خدا کا پیغام سننے سے محروم رہیں گے۔

درخت کو دیکھئے۔ ایک ہی مکمل وجود ہے مگر اس کی جڑیں نیچے زمین کی طرف جاتی ہیں اور اس کا تنہ اوپر فضا کی طرف بلند ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز میں دو متضاد خصوصیات کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی چوکنا ہو، تاکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو سکے۔ اس طرح آدمی کو چوکنا کر کے درخت یہ سبق دے رہا ہے کہ بلندی حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے نچلی سطح پر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرو۔

ہر چیز جو زمین پر کھڑی ہوئی ہو اس کا سایہ ہمیشہ نیچے پڑتا ہے۔ اصل اوپر اور سایہ نیچے کیوں۔ انسان کے اندر کھوج پیدا کرنے کے لیے تاکہ وہ سوچے۔ جب آدمی قدرت کے اس منظر پر سوچے گا تو اس پر یہ کھلے گا کہ زندگی کا سب سے اہم راز یہ ہے کہ ظاہری طور پر خواہ تم کو کتنی ہی بلندی حاصل ہو جائے، اپنے اندرونی وجود کو ہمیشہ متواضع رکھو۔

سمندر کو دیکھئے۔ سمندر کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ مگر یہی سمندر جب اپنے پانی کو بارش کی صورت میں انسانوں کے لیے برساتا ہے تو وہ میٹھا پانی بن جاتا ہے۔ سمندر اور اس کی بارش میں یہ فرق کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر سوچے۔ جب آدمی سوچے گا تو اس پر یہ حقیقت کھلے گی کہ تمہارے سینے میں خواہ تلخ جذبات امنڈ رہے ہوں مگر جب تم اپنے احساسات کو باہر نکالو تو اس کو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی مانند بنا کر نکالو۔

کائنات خدا کا سبق ہے، مگر وہ سبق اس کے لیے جس نے اپنے کان اور آنکھ کو کھلا رکھا ہو۔

قرآن اور عربی زبان

رومن امپائر کے زمانہ میں امپائر کی عام زبان لاتینی تھی۔ تاہم مختلف علاقوں میں لہجوں کا فرق تھا۔ زبان ایک تھی مگر لہجہ کے اعتبار سے وہ الگ الگ انداز میں بولی جاتی تھی۔ چوں کہ لہجہ کے اس فرق کو کسی ایک وحدت میں باندھے رکھنے کا ان کے پاس کوئی طاقتور ادبی معیار موجود نہ تھا، یہ فرق بڑھتا رہا، یہاں تک کہ لہجوں کا فرق بالآخر زبانوں کا فرق بن گیا اور مختلف زبانیں وجود میں آئیں جن کو اب رومی زبانیں (Romance languages) کہا جاتا ہے۔

یہی مختلف زبانیں ہیں جن کو موجودہ زمانہ میں فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، پرتگالی، رومانی زبانیں کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یورپ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں مثلاً (Occitan, Catalan, Sardinian, Rhaetian, Creoles) وغیرہ بھی اسی قدیم اصل کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ اس طرح ایک زبان کچھ صدیوں کے بعد ایک درجن زبان بن گئی۔

ایک زبان سے کئی زبان بننے کا یہی واقعہ عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ قدیم زمانہ میں مختلف عرب قبائل کے لہجوں میں زبردست فرق پایا جاتا تھا۔ آج بھی لہجوں کا یہ فرق مختلف عرب علاقوں میں بدستور موجود ہے۔ ایک لہجہ کا آدمی دوسرے لہجہ کے آدمی کی بات کو بمشکل سمجھ سکتا ہے۔

اس واضح فرق کے باوجود تمام عرب علاقوں کی تحریری زبان ایک رہی۔ وہ کئی زبان نہ بن سکی۔ عربی زبان کی وحدت براہ راست قرآن کا کرشمہ ہے۔ یہ تمام تر قرآن کا تاثیری کارنامہ ہے کہ اس نے عربی زبان کو ایک تحریری صورت پر باقی رکھا، اس نے عربی کو باعتبار تحریر، کئی زبان بننے نہیں دیا۔ بولنے کے وقت آدمی اپنے قبیلے کے لہجہ کی پیروی کرتا تھا، مگر لکھنے کے وقت وہ قرآن کی پیروی کرنے پر مجبور تھا۔ اسی طرح قرآن کا طاقت ور ادبی معیار ان کے لہجاتی فرق پر اس طرح چھایا رہا کہ اس نے ان کو الگ الگ ہونے سے روک دیا۔

قرآن سے پہلے عرب میں زیادہ تر صرف شاعری کا رواج تھا۔ لوگ اشعار کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اہل عرب کے نزدیک، قرآن سب سے پہلا کلام ہے

جو نثر کی صورت میں سامنے آیا (ان القرآن اول ظاهرة نثرية فنية عند العرب ،
جوزیف الہاشم، المفید فی الادب العربی)

پروفیسر ہٹی نے قرآن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کی ادبی تاثیر کا اندازہ اس وقت ہوجاتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ یہ صرف قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ایسا ہوا کہ عربوں کی مختلف بولیاں الگ الگ زبان کی صورت اختیار نہ کرسکیں، جیسا کہ رومی زبانوں کے ساتھ پیش آیا۔ آج ایک عراقی اگرچہ ایک مراکشی کی گفتگو کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے، مگر وہ اس کی تحریری زبان کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ عراق اور مراکش، اور اسی طرح شام، عرب، مصر، ہر جگہ کلاسیکی زبان کی حیثیت سے وہی عربی زبان رائج ہے جس کا ماڈل قرآن نے تیار کردیا ہے۔ محمدؐ کے وقت عربی نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب موجود نہ تھی۔ اس بنا پر قرآن سب سے قدیم نثری کتاب ہے اور یہی کتاب اول روز سے عربی نثر کا ماڈل بنی ہوئی ہے۔ اس کی زبان میں نغمہ ہے مگر وہ شعر نہیں۔ اس کی پُرنغمہ نثر نے ایک ایسا معیار قائم کردیا ہے کہ تقریباً ہر قدامت پسند عرب ادیب آج تک اہتمام کے ساتھ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, London 1970, p. 127

قرآن نے عربی زبان پر بیک وقت دو ایسے اثرات ڈالے ہیں جس کی مثال کسی بھی دوسری زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک یہ کہ قرآن نے عربی کو نظم سے نثر کی طرف موڑ دیا۔ قرآن سے پہلے عربی دورِ شعر میں تھی، قرآن کے بعد وہ دورِ نثر میں داخل ہوگئی۔

دوسرا بے مثال اثر یہ ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو ایک ایسا اعلیٰ اور آخری ماڈل دیدیا جو گویا عربی زبان کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قرآن کی یہی خصوصی دین ہے جس کی وجہ سے عربی زبان آج بھی اپنی سابقہ صورت میں زندہ ہے، اس کے بغیر عربی کا وہی انجام ہوتا جو دوسری تمام زبانوں کے ساتھ بلا استثنار پیش آیا ہے۔

رہبانیت

ثم قفینا علیٰ اٰثارھم برسلنا وقفینا بعیسیٰ ابن مریم وٰاتیناہ الانجیل وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ ورحمۃ ورھبانیۃ نِ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا

(الحدید ۲۷)

پھر ہم نے ان کے نقشِ قدم پر اپنے رسول بھیجے اور انھیں کے نقشِ قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی۔ اور رہبانیت کو مسیحیوں نے خود نکالا، ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا تھا۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی رضا چاہنا فرض کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

اس آیت میں رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی خدا کے نام پر دنیا کو چھوڑ دے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وہی تھیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے دو سو سال بعد ان کے پیرووں میں بگاڑ آگیا۔ ان کا ایک طبقہ رہبانیت میں پڑ گیا۔ وہ لوگ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گیے اور دنیوی چیزوں سے بے تعلق ہو کر شدید قسم کی مشقت برداشت کرنے لگے۔ (تفصیل کے لیے انسائیکلو برٹانیکا، جلد ۱۲، مقالہ (Monasticism)

ان کا یہ ترکِ دنیا مذہب کے معاملہ میں غلو اور تشدد سے پیدا ہوا۔ ان کو زہد کی تعلیم دی گئی تھی جس کا مطلب نفسیاتی زہد تھا۔ مگر انھوں نے نفسیاتی زہد کے حکم کو جسمانی زہد کا حکم قرار دے لیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں مشغول ہو مگر دنیا کو مطلوب و مقصود نہ بناؤ۔ مگر انھوں نے مطلوبیتِ دنیا کی نفی کو مشغولیتِ دنیا کی نفی کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی ہے حکمِ خداوندی کی صحیح رعایت نہ کرنا۔

مومن انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے مگر اس کی توجہ خدا کی طرف لگی رہتی ہے۔ وہ بظاہر مادی کام میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کا ذہن روحانی سطح پر سرگرم رہتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو آخرت میں بسیرا لیے ہوئے ہو۔

اپنے خلاف

موجودہ سائنسی زمانہ میں جو نئے ہتھیار ایجاد ہوئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ زہریلی گیسوں کو جمع کرکے ان کے "بم" بنائے گیے تاکہ انھیں دشمن کے اوپر چھوڑ کر اس کو ہلاک کیا جاسکے۔ مگر اب اس قسم کی زہریلی گیسوں کے ذخیرے تباہ کیے جارہے ہیں، کیوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ خود قابض ملک کے لیے بھی وہ زبردست خطرہ ہیں۔ امریکہ کی ایک خبر (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ جنوری ۱۹۸۹، سکشن ۲) میں بتایا گیا ہے کہ سالوں کے مطالعہ کے بعد امریکی فوج نے طے کیا ہے کہ وہ اپنے ۶۹۴۵۳ زہریلی گیس سے بھرے ہوئے راکٹوں کو تباہ کردے۔ اس کے لیے ذخیرہ کے مقام پر مخصوص قسم کی بھٹی تیار کی جائے گی۔ ایسے راکٹ امریکہ میں آٹھ مقامات پر موجود ہیں۔ یہ تمام راکٹ بھٹیوں میں ڈال کر تباہ کیے جائیں گے۔

زہریلی گیس کے ان مہلک ہتھیاروں کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ وہ خود قابض ملک کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک ہیں جتنا کسی دشمن کے لیے۔ یہ ہتھیار اگر زیادہ دن تک ذخیرہ رہیں تو وہ اچانک پھٹ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اندر سے کہر کی قسم کا ایک مادہ نکل کر پھیل جائے گا جس کے اندر نہ کوئی بو ہوگی اور نہ وہ دکھائی دے گا۔ مگر اس کے راستہ میں جو چیز پڑے گی سب ہلاک ہوجائے گی:

After years of study, the U.S. army has decided to destroy 69, 453 ageing, sometimes leaking rockets filled with deadly nerve gas and which are now stored in Richmond, Kentucky. It will build a special furnace at the depot to destroy them. There are similar rockets in seven other depots. They too will be burnt in incinerators. These poison gas weapons are now acknowledged to be as much a threat to the possessor as to the potential enemy. If kept too long, they could ignite spontaneously, releasing an odourless, invisible mist that would kill everything in the path.

یہ ایک نشانی ہے جو بتا رہی ہے کہ دوسرے کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ کوئی شخص تخریب کاری کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد اس کے برے نتیجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا، خواہ اس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی حیثیت حاصل ہو، اور خواہ اس نے اپنا تخریبی منصوبہ اعلیٰ ترین سائنسی سطح پر کیوں نہ بنایا ہو۔

مشکل میں آسانی

روایتی طرز کے کولھو میں جب گنا ڈالا جاتا ہے تو اس میں دباؤ کم ہوتا ہے اور اس کے بیلن کے درمیان سے گنا صرف ایک بار گزارا جاتا ہے۔ چنانچہ گنے کا رس تقریباً ۲۵ فی صد نکلے بغیر اس کے اندر رہ جاتا ہے۔ بجلی سے چلنے والے کرشر (Crusher) میں نسبتاً زیادہ دباؤ ہوتا ہے اور گنے کو بیلن کے درمیان سے دو بار گزارا جاتا ہے۔ تاہم یہاں بھی تقریباً ۱۵ فی صد رس اس سے نکل نہیں پاتا۔ بڑی بڑی ملوں میں بہت زیادہ دباؤ ہوتا ہے اور گنے کو چار بار مشینی بیلن کے درمیان سے گزارا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گنے کا تقریباً تمام رس اس سے باہر آجاتا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "دباؤ" کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان کے اندر تخلیقی طور پر بے حساب امکانات رکھ دیے ہیں۔ مگر کسی چیز کے اندر چھپا ہوا امکان صرف اس وقت نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس چیز پر دباؤ پڑے۔ دباؤ جتنا زیادہ شدید ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے اندرونی امکانات باہر آئیں گے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر بے حساب امکانات موجود ہیں۔ ہر انسان امکانات کا ایک لامحدود خزانہ ہے معمول کے حالات میں یہ امکانات انسان کے اندر چھپے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کہ انسان دباؤ کا شکار ہو۔ جب اس کی شخصیت کو نچوڑنے والے عمل سے گزارا جائے۔ تاریخ میں جن لوگوں نے بھی کوئی بڑی ترقی کی ہے وہ وہی لوگ تھے جو اپنے ماحول میں دباؤ کے حالات سے دوچار ہوئے۔ جنھوں نے اِنّ مع العُسر یسراً کے تخلیقی راز کو جانا۔ جنھوں نے زندگی کے میدان میں اس حوصلہ کے ساتھ قدم رکھا کہ وہ عُسر کی زمین سے یُسر کی فصل اگائیں گے۔

انسانی نگاہ مشکل کو مشکل کے روپ میں دیکھتی ہے۔ ربانی نگاہ وہ ہے جو مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھنے لگے۔

نظامِ خداوندی

گلاب کی نازک شاخ پر ایک خوبصورت پھول کھلا ہوا ہے۔ ایک شخص نے اس کو بے احتیاطی کے ساتھ توڑا۔ اس کی انگلیوں میں کانٹے لگ گئے۔ ان سے خون بہنے لگا۔ اب یہ آدمی اگر گلاب کے درخت کو یا فطرت کو الزام دے تو کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا۔ ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ ایسے موقع پر کانٹے کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ کیوں کہ اس دنیا کا نظام جس اصول کے تحت بنایا گیا ہے اس میں لازماً ایسا ہوگا کہ پھول کے ساتھ کانٹا بھی رہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ کانٹے کو ختم کرنے کی بے فائدہ کوشش نہ کرے بلکہ اپنی بے سمجھی اور نادانی کو ختم کرکے کانٹے سے بچے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسانی زندگی کا نظام خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور خدا نے اپنی مصلحت کے تحت یہاں "پھول" بھی رکھے ہیں اور "کانٹے" بھی۔ یہاں اچھے لوگ بھی ہیں اور برے لوگ بھی۔ یہاں فرشتے بھی ہیں اور شیطان بھی۔

اس نظامِ تخلیق کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مخالف بنیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف سازش کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اشتعال انگیزی کا معاملہ کرے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ حل قرآن کے لفظوں میں، صبر اور اعراض ہے۔ یعنی آدمی انسانی کانٹوں سے بچ کر چلے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی انسانی کانٹا اسے لگ جائے تو وہ صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ ٹکراؤ اور مقابلہ آرائی کا۔

مشہور مثل ہے کہ "کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ کتا اگر کتے پر بھونکے تو دوسرا کتا بھی بھونکنے لگے گا اور اس کو کاٹنے کے لئے دوڑے گا، لیکن کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ بھی کتے کے اوپر بھونکنے لگے یا اس کے خلاف جوابی کارروائی کے لئے دوڑے۔ ایسے مواقع پر کتا کتا ثابت ہوتا ہے اور ہاتھی ہاتھی۔

دنیا میں قدرت نے دو نمونے قائم کر دئے ہیں۔ ایک نمونہ کتے کا ہے اور دوسرا نمونہ ہاتھی کا۔ اب ہر آدمی کے حوصلہ کا امتحان ہے کہ وہ دونوں میں سے کس نمونہ کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

حوصلہ

دہلی کی ایک کالونی وسنت وہار ہے۔ یہاں ایک خاتون کملا دیوی اگروال اپنے بیٹے اور پوتے کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی عمر ۹۹ سال ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنے بستر پر ہی رہتی تھیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک حادثہ ہوا۔ ان کے گھر کے پچھلے دروازے کو کسی طرح کھول کر تین چور ان کے گھر میں گھس گیے۔ گھر کے لوگ بیدار ہو گیے اور چور اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تاہم وہ بوڑھی کملا دیوی کے کمرہ سے نقد اور سامان کی صورت میں دس ہزار کی چیز لے کر فرار ہو گیے۔

چوروں نے کملا دیوی اگروال کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ انھیں مارنے کی کوشش کی۔ تاہم صبح کو وہ مری ہوئی پائی گئیں۔ رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ دسمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، انھوں نے چوروں کی طرف ایک نظر دیکھا اور اچانک صدمہ کی وجہ سے وہ فوراً مر گئیں:

She took one look at the robbers and died of shock

مذکورہ مکان میں کملا دیوی اگروال بھی تھیں اور ان کے بیٹے اور پوتے بھی۔ مگر چور کو دیکھ کر بیٹے اور پوتے کی وفات نہیں ہوئی، البتہ بوڑھی کملا دیوی اچانک ختم ہو گئیں۔ ان دونوں کے درمیان وہ کیا فرق تھا جس کی وجہ سے ان کے انجام کے درمیان فرق ہو گیا۔ وہ فرق ہمت کا تھا۔ بیٹے اور پوتے میں ہمت تھی وہ جھٹکے کو سہہ سکتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ بچ گیے۔ مگر بوڑھی عورت اپنے اندر سہار کی طاقت کھو چکی تھی۔ وہ چوروں کو دیکھتے ہی جان بحق ہو گئی۔

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو ہمت والا ہو، جو ناخوش گوار حالات کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو اس کا وہی انجام ہوگا جو مذکورہ بوڑھی عورت کا ہوا۔ حوصلہ مندی کمزور آدمی کو طاقت ور بنا دیتی ہے، اور اگر حوصلہ نہ ہو تو طاقت ور آدمی بھی کمزور اور مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

سبب اپنے اندر

سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی چار بڑی حکومتیں قائم تھیں جو دنیا بھر میں مسلم طاقت کا نشان بنی ہوئی تھیں۔ انھیں میں عثمانی خلافت بھی تھی جو بغداد سے الجزائر تک، اور پھر عدن سے ہنگری تک پھیلی ہوئی تھی:

برصغیر ہند میں مغل سلطنت	(Mughal dynasty)
ایران میں صفوی سلطنت	(Safavid dynasty)
مراکش میں علوی سلطنت	(Alawi (Filali) dynasty)
ترکی میں عثمانی سلطنت	(Ottoman Empire)

اٹھارویں صدی کے آغاز سے ان حکومتوں پر زوال شروع ہوا۔ عین اسی وقت سے احیار و تجدید کی تحریکیں بھی جگہ جگہ شروع ہوگئیں۔ اب ان تحریکوں پر تقریباً تین سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر یہ تحریکیں نہ مذکورہ سلطنتوں کے زوال کو روک سکیں اور نہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوئیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سو سال کے اندر مسلمانوں نے دوبارہ عزت و سربلندی کے مقام کو پالیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے شمار قائدوں اور بزرگوں کی تین سو سالہ جدوجہد بھی ناکامی کی تاریخ کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کر سکی۔

اصل یہ ہے کہ زوال کے پچھلے تمام واقعات زیادہ تر جارحیتِ غیر کے واقعات تھے۔ اس لیے اغیار کے حملہ کا مقابلہ کر کے ابتدائی صورت حال کو دوبارہ بحال کر لیا گیا۔ مگر موجودہ زمانہ کا زوال خود مسلمانوں کے فکری اور ایمانی انحطاط کے نتیجہ میں پیش آیا۔ اب ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے اندر فکری انقلاب اور ایمانی حرارت پیدا کرنے سے اپنی کوشش کا آغاز کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے تمام رہنما بدستور اغیار کے حملوں کو سبب زوال قرار دے کر ان سے بے فائدہ لڑائی لڑتے رہے۔ جب بیج ہی نہ ڈالا گیا ہو تو درخت کہاں سے اُگے گا۔ چنانچہ بے شمار قربانیوں کے باوجود احیار ملت کا خواب بھی پورا نہیں ہوا۔

پٹرول کے بغیر

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب نے نیا اسکوٹر خریدا۔ یہ "بجاج سپر" تھا جو بہت اچھا اسکوٹر سمجھا جاتا ہے۔ دس سال تک لائن میں رہنے کے بعد یہ قیمتی اسکوٹر انھیں ملا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۳ کی صبح کا واقعہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ مذکورہ پڑوسی اپنے اسکوٹر کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور بار بار پاؤں مار کر اس کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ اسی حال میں کافی دیر ہو گئی۔ یہ بات مجھ کو بڑے اچنبھے کی معلوم ہوئی کہ ایک نیا اور عمدہ اسکوٹر اسٹارٹ نہ ہو۔

اتنے میں ان کا ایک دوست وہاں آگیا۔ وہ اس طرح کے معاملات سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا پٹرول چیک کیا۔ اس نے کہا: "گاڑی میں پٹرول تو ہے نہیں، پھر وہ اسٹارٹ کیسے ہو" اس کے بعد وہ دونوں رزرو پٹرول استعمال کر کے اسکوٹر کو پٹرول پمپ تک لے گیے۔ پٹرول بھرنے کے بعد مذکورہ اسکوٹر سڑک پر اسی طرح دوڑنے لگا جس طرح ایک اچھے اسکوٹر کو دوڑنا چاہیے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی وہی ہوا ہے جو مذکورہ اسکوٹر کے ساتھ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلم رہنما ہیں جو ملت کے احیاء کے لیے اٹھے۔ کسی نے تبلیغی ادارہ قائم کیا، کسی نے حزب اللہ بنائی۔ کسی نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا نعرہ دیا، کسی نے ملی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ مگر مسلم قوم ان آوازوں پر متحرک نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعمیری نقشہ کو چھوڑ دیا اور جذباتی سیاست کی رو میں داخل ہو گیے۔

مسلم رہنماؤں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "پٹرول" کے بغیر "گاڑی" کو چلانا چاہا۔ انھوں نے تعمیر شعور کا کام کیے بغیر عملی اقدام سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ٹھوس تعمیر کا کوئی کام نہ کر سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ پہلے خاموش فکری جدوجہد کے ذریعہ لوگوں کا ذہن بناتے، اس کے بعد عملی اقدام کرتے تو یقیناً انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی۔ ملت کی گاڑی بھی اسی طرح چل پڑتی جس طرح مذکورہ شخص کی گاڑی پٹرول بھرنے کے بعد چل پڑی۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ "مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جاسکے"۔ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمراں جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور نکالنے لگے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مستشرق آلان روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفیٰ کمال الجابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گیے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قاہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گیے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عبقری مہارت رکھتے تھے (خطة حربية عالية المستوى تدل على عبقرية صلاح الدين العسكرية) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کر لیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چلی گئی۔

فرانسیسی مستشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کر دیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مفلسی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہو گیے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

فقد کان المورخ الفرنسی (جوستاف لوبون) علی حق عندما قال جملته المأثورة: لم یعرف التاریخ فاتحاً أرحم من العرب (صفحہ ۱۰۱)

فرانسیسی مورخ گستاو لیبان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ رحم دل فاتح نہیں دیکھا

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۹۴۶-۱۸۶۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انسانی برابری اور انسانی اخوت کا وعظ اگرچہ یسوع مسیحؑ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار جس شخصیت نے واقعی معنوں میں ایک عملی معاشرہ قائم کیا، وہ صرف عرب پیغمبر محمدؐ تھے:

H.G. Wells, *The Outline of History* (1920).

پانچ دن

پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہندستان کی سیاست میں انھیں مہاتما گاندھی کے بعد سب سے اونچا مقام ملا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو وہ ملک کے وزیر اعظم بنائے گیے اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وزیر اعظم رہے۔ ملکی اور عالمی سیاست میں انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے ایک پریس کانفرنس کی۔ یہ پریس کانفرنس ۲۲ مئی ۱۹۶۴ کو نئی دہلی میں ہوئی۔ اس پر ہجوم پریس کانفرنس میں جو کارروائی ہوئی اس کا ایک جزء یہ تھا:

The last question however, was, as Nehru himself put it, a leading one. Referring to a recent television interview in which Nehru had said that he was not grooming his daughter as his successor, a correspondent asked whether it was not preferable that he settle the question in his lifetime. Reclining in his chair, a smiling Jawaharlal Nehru replied, 'My life is not going to end so soon.' There were more than 300 journalists present. They thumped their desks and cheered. Jawaharlal went off to Dehra Dun for his last holiday after that press conference.

M.J. Akbar, Nehru: *The Making of India*, 1988, p. 581

پریس کانفرنس کا آخری سوال، جیسا کہ خود نہرو نے کہا، سب سے اہم تھا۔ ایک حالیہ ٹیلی وژن انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں نہرو نے کہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی (اندرا گاندھی) کو اپنے جانشین کی حیثیت سے تیار نہیں کر رہے ہیں، ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ اس سوال کو اپنی زندگی ہی میں طے کر دیں۔ اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر، ایک مسکراتے ہوئے جواہر لال نہرو نے جواب دیا: میری زندگی اتنی جلد ختم ہونے والی نہیں۔ اس موقع پر ۳۰۰ سے زیادہ صحافی موجود تھے۔ انھوں نے اپنی میز پر گھونسا مارا اور بہت خوش ہوئے۔ جواہر لال اس پریس کانفرنس کے بعد اپنی آخری چھٹی منانے کے لیے دہرہ دون روانہ ہوگیے (صفحہ ۵۸۱)

اس واقعہ کے صرف پانچویں دن ۲۷ مئی ۱۹۶۴ کو نئی دہلی میں جواہر لال نہرو کا انتقال ہوگیا۔ نہرو وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ "میری زندگی جلد ختم ہونے والی نہیں"

مگر عین اسی وقت قضاء وقدر کا یہ فیصلہ ہو رہا تھا کہ نہرو کی زندگی بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ اور واقعات بتلاتے ہیں کہ نہرو کے فیصلہ پر قضا وقدر کا فیصلہ غالب آیا۔

"میری زندگی جلد ختم ہونے والی نہیں" ——— یہی موجودہ دنیا میں ہر آدمی کی نفسیات ہے۔ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی انداز میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کے اور اس کی موت کے درمیان صرف "پانچ دن" کا فاصلہ ہے۔ مگر ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں ابھی جلد مرنے والا نہیں ہوں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ آدمی جس حال میں ہے، وہ اسی حال میں پڑا رہتا ہے، وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہیں کرتا۔

ایک شخص غفلت اور سرکشی کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اگر وہ جانے کہ پانچ دن سے زیادہ اس کی سرکشی چلنے والی نہیں تو وہ سرکشی کو بھول کر اطاعت شعار آدمی بن جائے۔ ایک شخص جھوٹے الفاظ بول کر لوگوں کے درمیان لیڈری کر رہا ہے۔ اگر وہ جانے کہ پانچ دن کے بعد اس کا سارا بھرم کھل جانے والا ہے تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے اور وہ لیڈری کو چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جانے کو پسند کرے۔ ایک شخص نے دوسرے کے مال پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر وہ جانے کی یہ مال اب میرے پاس صرف پانچ دن تک باقی رہنے والا ہے تو وہ مال اس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ بن جائے اور وہ ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سر سے اتار پھینکے۔

ہر آدمی موت کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے، لیکن ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ موت سے بہت دور ہے۔ یہی غلط فہمی سب سے بڑا فساد ہے، اور اس غلط فہمی سے نکلنا سب سے بڑی اصلاح۔

یہ انسان

لکھنؤ کا ایک قصہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں پلیٹ لیے ہوئے چوک پر کھڑی تھی اور یہ آواز لگا رہی تھی: کوئی متبخن کھلا دے، کوئی متبخن کھلا دے۔

ایک راہ گیر اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پلیٹ متبخن سے بھری ہوئی ہے راہ گیر کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب اس کے پاس متبخن موجود ہے تو پھر کیوں وہ لوگوں سے متبخن کا سوال کر رہی ہے۔ راہ گیر نے عورت سے کہا کہ ماں، تمہارے پاس تو متبخن خود موجود ہے، پھر تم کس لیے متبخن مانگ رہی ہو۔ عورت نے یہ بات سنی تو بگڑ کر بولی: تم کیسی بات کرتے ہو، متبخن کہیں بالائی کے بغیر بھی کھایا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے یہ قصہ سنایا تو اس کو سن کر اچانک میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گیے۔ میں نے سوچا کہ انسان آج بالائی کے بغیر متبخن کھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ کل اس کا حال کیا ہوگا جب کہ متبخن تو درکنار، درخت کی پتیاں بھی نہ ہوں گی جن سے وہ اپنا پیٹ بھرے، اور گڑھے کا پانی بھی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس دور کرے۔

آج کوئی انسان کم پر راضی نہیں۔ کسی کے پاس چھوٹا مکان ہے تو وہ بڑے مکان پر نظر لگائے ہوئے ہے۔ کوئی ہزار کما رہا ہے تو وہ لاکھ کی فکر میں ہے۔ کوئی ممبر ہے وہ صدر بننے کے لیے دوڑ لگا رہا ہے۔ کسی کو ملکی قائد کا درجہ ملا ہے تو وہ انٹرنیشنل قائد بننے کے لیے بے قرار ہے۔ کوئی پیسہ حاصل کر چکا ہے تو اب وہ شہرت اور جاہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

کوئی شخص "سادہ متبخن" پر راضی نہیں، ہر آدمی "بالائی والے متبخن" کی طرف چھلانگ لگا رہا ہے۔ آدمی اگر جانے کہ عنقریب موت آکر ساری صورت حال کو بدل دے گی۔ اس کے بعد نہ موجودہ دنیا ہوگی اور نہ موجودہ دنیا کے حالات، تو اس کی سوچ کچھ سے کچھ ہو جائے، وہ آج سے زیادہ کل کی فکر کرنے لگے۔ وہ حرص کو چھوڑ کر شکر کرنے والا بن جائے، وہ خواہشوں کے بجائے ذمہ داریوں کی طرف اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس کا ذہن ذاتی خول سے نکل کر انسانی وسعت کے دائرہ میں کام کرنے لگے۔

ایک آیت

قرآن میں یہود کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ ـــــــ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں بہت سا مال رکھو تو وہ فوراً اس کو ادا کر دے گا۔ اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں ایک دینار رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہیں کرے گا، الّا یہ کہ تم اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ (آل عمران ۷۵)

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے اندر حق اور ناحق کی تمیز پوری طرح زندہ ہو۔ وہ سچ پر قائم ہونا چاہتے ہوں اور جھوٹ سے بھاگنے والے ہوں۔ وہ ہر آن اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھتے ہوں۔ یہ با اصول لوگ ہیں۔ وہ اپنے احساسِ فرض کے تحت ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔ ان کا حق شناسی کا جذبہ اس کے بغیر مطمئن نہیں ہوتا کہ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کریں۔ وہ کسی حال میں حق سے تجاوز کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔

انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف اپنی خواہش اور اپنے مفاد کو جانتے ہوں۔ وہ چیزوں کو اس اعتبار سے نہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھیں کہ کیا چیز میرے موافق ہے اور کیا چیز میرے خلاف۔

ایسے لوگ کبھی حق کی ادائیگی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور اگر کبھی حق کو ادا بھی کرتے ہیں تو احساسِ فرض کے تحت نہیں بلکہ حالتِ مجبوری کے تحت۔

ایک انسان وہ ہے جس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے تو وہ اس کو غیر کی ملک سمجھے اور جب مالک تقاضا کرے تو فوراً اصل مالک کو وہ چیز لوٹا دے۔ یہ معیاری انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کا بڑا اجر ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر امانت کا احساس پوری طرح زندہ نہ ہو۔ تاہم ابھی وہ سرکشی کی حد پر نہ پہنچا ہو۔ ایسا شخص بھی چیز کو اصل مالک کی طرف لوٹاتا ہے مگر بار بار کے تقاضے کے بعد۔ دوسرے انسان کی بدترین قسم ہے جس کو غاصب کہا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ چیز کو نہیں لوٹاتا بلکہ جھوٹے دعوے کر کے غیر کی چیز کو اپنی چیز بتاتا ہے۔ ایسا آدمی گمراہی کی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ ایسے آدمی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

قول وعمل کا تضاد

نئی دہلی میں ۱۶ - ۱۹ جنوری ۱۹۸۹ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی جس میں دنیا بھر کے نمائندے اور دانشور جمع ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا ــــ عالمی شہری کی تیاری:

The Making of an Earth Citizen

اس "عالمی شہری کانفرنس" کا افتتاح ہندستان کے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے کیا تھا۔ وگیان بھون کے ایک ممتاز انٹرنیشنل اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک ایسے نئے عالمی نظام کی تشکیل کرنے کی اپیل کی جس میں ہم سب علاقائی امتیازات سے بلند ہو کر آفاقی شہری بن جائیں۔ کیوں کہ یہ کرۂ ارض کسی ایک قوم کے لیے نہیں، بلکہ یکساں طور پر ہر ایک کے لیے ہے۔ عالمی شہریت کے اصول کو تسلیم نہ کرنے ہی کا نتیجہ وہ خطرناک تفریق اور امتیازات ہیں جو موجودہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور اسی تقسیم کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی عظیم اکثریت اپنے جائز حصہ سے بھی محروم ہے۔ ان مصنوعی فاصلوں کو ختم کرنے کے لیے جنھوں نے انسانی سماج کو مختلف امتیازات کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا ہے، ایک نیا آغاز بالکل ضروری ہے۔ انھوں نے مسز اندرا گاندھی کا یہ قول دہرایا کہ یہ دنیا ایک ہی کنبہ ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۱۷ جنوری ۱۹۸۹)

ہندستان کے لیڈر انٹرنیشنل اسٹیج پر دنیا کے تمام لوگوں کو یکساں شہری حقوق دینے کا وعظ کہتے ہیں، مگر خود اپنا ملک جہاں انھیں اقتدار حاصل ہے، وہاں کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق دینے کے لیے تیار نہیں۔ امتیاز پسند سماج کا حکمراں بن کر وہ بے امتیاز سماج قائم کرنے کی اپیل کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما بھی قول وعمل کے اسی تضاد میں مبتلا ہیں۔ وہ عدل وانصاف پر تقریریں کرتے ہیں اور خود اپنی زندگی کو عدل وانصاف کی پابندی سے آزاد کیے ہوئے ہیں۔ وہ اسٹیج پر احتساب عالم کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انھیں احتساب خویش کی یاد دہانی کرائے تو وہ اس کے دشمن بن جائیں گے۔

تقدس کی پامالی

ایک مسلمان کا مراسلہ قومی آواز (۱۶ دسمبر ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس میں ہندستانی حکومت کی شکایت کی گئی ہے کہ مسلم جماعتوں کی کوشش کے باوجود اس نے "محکمۂ آثار قدیمہ کے تسلط والی مسجدوں میں نماز کی ادائیگی کی اجازت نہیں دی"۔ مراسلہ کا خاتمہ ان جذباتی الفاظ پر ہوتا ہے: "مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان مساجد میں نماز پڑھ سکیں، جب کہ ٹورسٹوں کو آزادی ہے کہ وہ ان مساجد میں جائیں، وہاں کھائیں پئیں، ہنسیں بولیں، ٹرانسسٹروں پر گانے سنیں اور موج آئے تو ان گانوں کی دھن پر رقص بھی کرکے ان مساجد کے تقدس کو پامال کریں"۔ (صفحہ ۶)

اس معاملہ میں مسلم رہنما اب تک صرف حکومت ہند کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھیں خود اپنے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ حکومت ہند کا معاملہ نہیں، بلکہ خود خدا کا معاملہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے (حرمة المومن اکرم حرمة من الکعبة) مومن کی عزت و آبرو اتنی زیادہ قابل احترام ہے کہ کعبہ کے احترام سے بھی اس کا درجہ بڑھا ہوا ہے، عام مساجد تو درکنار۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اور ان کے تمام اصاغر و اکابر مسلسل اس عظیم تر جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

موجودہ مسلمانوں کا حال، تقریباً بلا استثناء، یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی سے انھیں اختلاف یا شکایت ہو جائے تو وہ فوراً اس کی عزت و آبرو کو اپنے لیے حلال سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس مسلمان کی عیب جوئی، اس کے خلاف الزام تراشی، اس کا استہزاء و تمسخر، اس پر جھوٹی تہمت لگانا سب ان کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔ مومن کے تقدس کی پامالی کا یہ کام موجودہ مسلم معاشرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ مگر کوئی ایک شخص نہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ یہاں ہر بہادر عملاً بزدل بنا ہوا ہے ——— مسلمانوں کا یہی جرم ہے جس نے انھیں خدا کی نظر میں معتوب بنا دیا۔ مسلمانوں نے خدا کے دین کے تقدس کو پامال کیا۔ اس کے نتیجہ میں خدا نے لوگوں کو چھوٹ دیدی کہ وہ مسلمانوں کے قومی تقدس کو پامال کریں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خدا کی طرف دوڑنا چاہیے، کسی انسانی حکومت کی طرف دوڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

جرم کی نفسیات

لینن (Lennon) اور چیپ مین Chapman امریکہ کے دو بیٹل سنگر (Beatle Singer) تھے۔ لینن کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ کافی مشہور ہوگیا۔ یہ بات چیپ مین کو برداشت نہ ہوسکی۔ اس کے دل میں لینن کے خلاف حسد کا جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک روز موقع پاکر لینن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق اس قتل کا سبب پیشہ ورانہ رقابت (Professional Rivalry) تھی۔ اس کے بعد چیپ مین کے خلاف مقدمہ چلا۔ قاتل نے اس سلسلے میں عدالت میں اپنا جو بیان دیا، اس میں اپنی برأت ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

There is something bad within me, and there is something good within me too. When this little bad within me overpowers my goodness, I do bad deeds.

میرے اندر کچھ برائی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر کچھ بھلائی بھی ہے، جب میری برائی میری بھلائی پر غالب آجاتی ہے تو اس وقت میں برا کام کر بیٹھتا ہوں۔

قاتل کا یہ جملہ اگر سنجیدہ ذہن کے تحت نکلا ہے تو یقیناً وہ فطرت کی ترجمانی ہے۔ بلاشبہ کچھ مجرم عادی مجرم ہوتے ہیں، ان کو معاف کرنا انسانیت کے اوپر ظلم کرنا ہے۔ مگر بہت سے جرم کرنے والے محض وقتی جذبہ کے تحت جرم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فطرت زور کرتی ہے۔ اپنے جرم پر انھیں اس قدر افسوس لاحق ہوتا ہے کہ ان کا افسوس خود ان کے لئے ایک داخلی سزا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ غلطیوں کو معاف کرو۔ وقتی جذبہ کے تحت جب ایک آدمی کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کے بعد اس کے دل میں خود ہی اس کے خلاف شرمندگی اور افسوس کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم اس کو معاف کر دیں تو گویا ہم نے اس کے احساس ندامت کو سہارا دیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور دوبارہ ایسی غلطی کرنے سے بچے۔

اسلام میں اگرچہ قتل کی سزا قتل ہے تاہم ایک خاص صورت کے ساتھ اس کو قابل معافی بھی رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے ورثار اگر قاتل سے دیت لینے پر راضی ہوجائیں تو اس کو دیت لے کر چھوڑ دیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے۔

عجیب تضاد

ٹائمس آف انڈیا (سکشن ۲) کے شمارہ ۱۲ جنوری ۱۹۸۹ میں صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی ہے۔ اس تصویر کو ہم عبرت کے لیے یہاں نقل کر رہے ہیں۔ اس تصویر میں جو آدمی ہاتھ باندھ کر اور ننگے پاؤں نیچے زمین پر کھڑا ہوا ہے، وہ ہندستان کی ریاست اتر پردیش کے موجودہ چیف منسٹر مسٹر این ڈی تیواری ہیں۔ اور اوپر جو دبلا اور بوڑھا آدمی اپنا ایک پاؤں ان کے سر پر رکھے ہوئے

توہم پرستی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے

The U.P. chief minister, Mr N.D. Tiwari, being blessed by saint Deoraha Baba at Vrindaban recently. The saint blesses devotees by placing his foot on their heads — UNI

ہے، وہ ایک ہندو مہاتما دیوراہا بابا ہیں۔

یہ ورندابن (اتر پردیش) کا واقعہ ہے۔ باباجی وہاں آبادی سے دور لکڑی کے ایک مچان پر رہتے ہیں۔ اور اپنے عقیدت مندوں کو آشیرواد دینے کے لیے ان کے سر پر اپنا پاؤں رکھتے ہیں۔ جس آدمی کے سر پر وہ اپنا پاؤں رکھ دیں وہ بہت خوش قسمت آدمی سمجھا جاتا ہے۔

یہ واقعہ علامتی طور پر موجودہ ہندستان کی تصویر ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ وہ ملک کو جدید اصولوں کے مطابق چلائیں گے، وہ اس کو ماڈرن ورلڈ کا ایک حصہ بنائیں گے۔ کاغذی طور پر اگرچہ یہ اعلان کر دیا گیا، مگر یہاں کے تقریباً تمام لیڈر اپنے فکر کے اعتبار سے قدیم توہماتی دور میں پڑے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت دو سمتوں میں دوڑتے رہے۔ ایک طرف سائنس پسندی اور دوسری طرف توہم پرستی۔ دوعملی کی یہی صورت حال ہے جس سے متاثر ہو کر اقبال احمد سہیل نے کہا تھا:

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمتِ سفر نیرنگِ زمانہ کیا کہیے

جلد ہی ملکی آزادی پر پچاس سال پورے ہو جائیں گے مگر طویل مدت اور ہر قسم کے وسائل کے باوجود ہندستان ابھی تک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکا۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ ہندستان کے لیڈر بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں پاتے۔

شام کو تمام شرکاء کو کابل کے باہر ایک کھلے مقام پر لے جایا گیا۔ یہاں "شہدای راہ انقلاب" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دور تک "اپریل انقلاب" میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مخصوص فوجی آداب کے ساتھ "شہداء" کو پھول (Wreath) چڑھایا گیا۔ میرے لئے یہ منظر نیا تھا۔ مجھے کسی شخص کا یہ قول یاد آیا کہ حکومت کے خلاف مسلح اقدام اگر کامیاب نہ ہو تو وہ بغاوت ہے، اگر کامیاب ہو جائے تو وہ انقلاب ہے۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر نجیب (رئیس جمہوریہ افغانستان) اور دوسرے اعلیٰ حکومتی ذمہ دار اسٹیج پر موجود تھے۔ کارروائی کا آغاز ایک نابینا قاری کی تلاوت سے ہوا۔ انھوں نے سورۂ احزاب کا وہ حصہ پڑھا جس میں یہ آیت ہے: یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ۔ میں نے سوچا کہ اگر بالفرض آج کوئی نئی کتاب اترے اس میں مذکورہ الفاظ ہوں اور ان کو لے کر کوئی شخص ایک ایسے اجتماع میں ان کی تلاوت کرنے لگے جہاں وقت کے حکمراں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو شاید اس کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ مگر قاری اس قسم کی آیت قرآن سے پڑھتا ہے تو کسی کے اندر کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نیا پیغمبر اس کو زندہ پیغام کے طور پر پڑھے گا، اور نابینا قاری اس کو صرف ایک روایتی قرأت کے طور پر اس کا ترنم کر رہا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام سے مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جو ۲۳ اکتوبر کی شام تک جاری رہا۔ میں نے جو مقالہ پیش کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

The Prophet of Islam: Benefactor of Humanity

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۲۲ اکتوبر کو یہاں کے ٹیلی وژن والوں نے انٹرویو لیا۔ اپنے مرکز کے تعارف کے بعد میں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک اسلام کا مطلب ہے آخرت اورینٹڈ لائف۔ دوسری بات میں نے وہی کہی جو الرسالہ میں بار بار آتی ہے۔ یعنی تصادم کو اوائڈ کرتے ہوئے ممکن دائرۂ عمل میں اپنا کام کرنا۔ اس سلسلہ میں میں نے مزید کہا کہ یہ باتیں میں خاص طور پر افغانستان کے پس منظر میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا مستقل پیغام ہے جس کی میں پچھلے ۳۰ سال سے برابر تبلیغ کر رہا ہوں۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں غالباً ہندستان کا اکیلا شخص ہوں جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ ایک

ہی بات کہتا ہے۔ ورنہ میری معلومات کے مطابق، ہندستان کے تمام علما اور قائدین اس معاملہ میں ذوالوجہین ہورہے ہیں۔ وہ ہندستان میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر تصادم اور ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں، اور جیسے ہی وہ کسی مسلم ملک کے ہوائی اڈہ پر اترتے ہیں ان کی زبان بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ لوگ باہر کے مسلم ملکوں میں جو بات کہتے ہیں، وہی میں دونوں جگہ کہتا ہوں۔ البتہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ باہر کے مسلم ملکوں کے لئے ان کا ٹیپ دوسرا ہے اور ہندستان کے لئے دوسرا۔

کابل سے ایک فارسی روزنامہ ہیواد نکلتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ میں میرا انٹرویو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک فلسطینی جو اسپین میں رہتے ہیں اور اسپینی زبان بخوبی جانتے ہیں، انھوں نے بھی ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں انٹرویو لیا۔ اس کو وہ اسپین کے بعض اخبارات میں شائع کریں گے۔ وہ اسپین ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور بعض اسپینی اخبارات کے نامہ نگار ہیں۔ ان کا نام سعید علمی ہے اور وہ میڈرڈ میں رہتے ہیں۔

سعید علمی صاحب نے اسپین میں اسلام کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں اسلام کی تبلیغ کے مواقع ہیں۔ کیوں کہ موجودہ نظام کے تحت وہاں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ اسپینی زبان میں اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قرآن کا اسپینی ترجمہ کسی مسلمان کے ہاتھ کا کیا ہوا موجود نہیں۔ البتہ ایک ترجمہ ہے اور وہ اسپین کے مسیحی کا کیا ہوا ہے:

لا یوجد فی اسبانیا قرآن مترجم الی الاسبانیۃ علی ید مسلمین۔ و لکن یوجد مترجما علی ید مسیحی اسبان۔

ایک صاحب نے پیغمبر اسلام کی عظمت پر مقالہ پیش کیا۔ آپ کے ذریعہ دنیا میں اصلاح اور انقلاب کا جو دور آیا، اس کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ تمام نبیوں سے افضل تھے۔ آپ کا دین دوسرے تمام دینوں کے مقابلہ میں مکمل تھا۔ وغیرہ۔ میں نے ان کے مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بطور واقعہ درست ہے کہ پیغمبر اسلام کے ذریعہ دنیا میں عظیم ترین اصلاحی انقلاب آیا۔ مگر اس کی وجہ افضلیت اور اکملیت نہ تھی جس کو آپ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ نتیجۂ توحید تھا نہ کہ نتیجۂ اکملیت۔

اصل یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں "توحید" کا نتیجہ ہیں۔ توحید ہی ہر قسم کی اصلاح و ترقی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پچھلے دور میں جو انبیاء آئے ان کا دین بھی توحید کا دین تھا۔ انھوں نے بھی اسی توحید کی

دعوت دی جس کی دعوت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ مگر دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کی دعوت صرف فکری اور نظریاتی مرحلہ میں رہی، وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ توحید کی تبلیغ کے باوجود توحید کے عملی نتائج ظہور میں نہیں آرہے تھے۔ پیغمبر اسلام نے دعوتِ توحید کو انقلابِ توحید تک پہنچا دیا۔ جب ایسا ہوا تو انسان کو اس کے نتائج ملنا شروع ہوگئے جن سے وہ اب تک محروم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کے درمیان جو فرق ہے وہ نفس دین کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ دین کے اظہار کے اعتبار سے ہے۔

ایک صاحب نے سیاسی انداز میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خاص نشانہ امریکہ تھا۔ اپنی پرجوش تقریر میں وہ ظالم امریکہ، مردود امریکہ اور شیطان امریکہ جیسے الفاظ بے تکلف استعمال کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل جس کے وسیع ہال میں یہ تقریر ہو رہی ہے، وہ ایک امریکی کمپنی کا بنوایا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ افغانستان کے پاس سارے ملک میں دوسرا کوئی ہوٹل یا ہال نہیں جہاں ایک بین اقوامی سطح کی سیرت کانفرنس شایان شان طور پر کی جاسکے۔ ایسی حالت میں امریکہ کو برا بھلا کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس امریکہ کے نفوذ کا یہ حال ہو کہ اس کو گالی دینے میں جو پیسہ خرچ ہو وہ بھی اسی کی جیب میں جائے، ایسے امریکہ کا مقابلہ عمل کے اسٹیج پر کیا جاسکتا ہے نہ کہ کسی قسم کے لفظی اسٹیج پر۔

ایک بڑے کمرہ میں افغانستان کی اسلامی مطبوعات کی نمائش کی گئی تھی۔ بڑی تعداد میں مختلف موضوعات پر کتابیں موجود تھیں۔ ایک کتاب کا نام تھا: نقش علماء در دعوت بہ صلح۔ اس کے "نویسندہ" ڈاکٹر عبدالغفور باہر تھے۔ اس کتاب کا موضوع تھا: صلح کی دعوت میں علماء کا رول۔ اس کو عربی میں کہہ سکتے ہیں: دور العلماء فی الدعوۃ الی السلم۔

اس کتاب کا پہلا جملہ یہ تھا کہ یہ واضح بات ہے کہ اسلام کی دعوت عالمی دعوت ہے اور دنیا میں رحمت لانے کے لئے ہے (واضح است کہ دعوت اسلام دعوت جہانی و تامین رحمت است)

یہاں مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جو لوگ عربی یا انگریزی زبان جانتے تھے، ان سے گفتگو کرنا آسان تھا۔ مگر جو لوگ صرف اپنی مقامی زبان جانتے تھے، ان سے براہ راست ربط قائم نہیں جاسکتا تھا۔ ایک موقع پر میرے ساتھ اسی قسم کی "بے بسی" پیش آئی۔ اس تجربہ کے موقع پر بے اختیار مجھے آخرت کی دنیا یاد آگئی۔ میری زبان سے نکلا: آخرت کی دنیا کیسی عجیب دنیا ہوگی۔ وہاں تمام انسانوں سے ایک زبان میں کلام

کرنا ممکن ہوگا۔ وہاں تمام انسانوں کی سطح ایک ہو جائے گی۔ وہاں ہر آدمی حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ وہاں کسی کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ وہ دھواں بکھیر کر فضا کو آلودہ کرے۔ وہاں کسی کو یہ قدرت نہ ہوگی کہ وہ ظلم اور جبر کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہو جائے اور پھر اپنی ذات کو بچانے کی خاطر سارے معاملات کو تہس نہس کر ڈالے۔ وہاں کسی کو یہ موقع نہ ہوگا کہ جھوٹ اور استحصال کی بنیاد پر لیڈر بن جائے۔

آخرت کی دنیا میں ہر چیز اپنی اصل تخلیقی حالت پر ہوگی۔ وہاں ہر آدمی کو اس حد پر ٹھہرنے کے لئے مجبور کر دیا جائے گا جو اس کی واقعی حد ہے۔ وہاں ہر قسم کا مصنوعی فرق مٹ چکا ہوگا۔ موجودہ دنیا اگر انسانی دنیا ہے تو وہ ربانی دنیا ہوگی۔ کیسی عجیب ہوگی یہ آنے دنیا، اور کیسے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو اس معیاری دنیا میں آبادکاری کے لئے منتخب کئے جائیں۔

کانفرنس کی کارروائی کل شام کو ختم ہوگئی۔ اگلی صبح کو میں کابل کے ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل (روم ۳۲۸) میں میز کے سامنے بیٹھا ہوں۔ سورج کی روشنی دیواری شیشہ سے گزر کر کمرہ میں آرہی ہے۔ ذہن میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا نقشہ گھوم رہا ہے۔ اچانک مجھے فارسی کا یہ شعر یاد آیا:

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح　　　　در عمارت گری گنبد اسلاف خود اند

میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ کا نصف حصہ اگر "گنبد اسلاف" کی تعمیر میں مشغول ہے تو بقیہ نصف حصہ "گنبد خویش" کی تعمیر میں۔ جہاں تک "خانۂ شریعت" کی تعمیر کا تعلق ہے، اس سے حقیقی طور پر کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے ایک تاثر طاری ہوا جو ان لفظوں میں ڈھل گیا: اپنے کو اسلامی ظاہر کرنے کے لئے ہر شخص دوڑ رہا ہے، مگر اپنے کو اسلامی بنانے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے ہر آدمی بےقرار ہے، مگر اسلام کی خاطر اپنا جھنڈا گرانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اسلام کے گنبد پر ہر شخص کھڑا ہونا چاہتا ہے، مگر اسلام کی بنیاد میں دفن ہونا کسی کو گوارا نہیں ——— کیا عجیب ہے وہ اسلام جو سب کچھ ہو مگر اسلام ہی نہ ہو۔

ایک افغانی نوجوان جس نے بی اے کے مرحلہ تک تعلیم حاصل کی ہے، اس سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں ایسے لوگ کتنے ہوں گے جنھوں نے بی اے کیا ہو۔ اس کا جواب تھا کہ سو میں ایک۔ یہی افغانی قوم کی اصل کمزوری ہے۔ وہ بے حد بہادر قوم ہیں۔ مگر بہادری میں وہ جتنا آگے ہیں، تعلیم میں وہ اتنا ہی پیچھے ہیں۔ وہ لوگ جن کو "افغانی مجاہدین" کہا جاتا ہے، وہ ایک درجن تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں،

تاہم ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں۔

غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے افغانی مجاہدین ایک بات کو جانتے ہیں، مگر وہ دوسری اہم تر بات کو نہیں جانتے۔ وہ اس بات کو مبالغہ آمیز حد تک جانتے ہیں کہ ان کی شجاعت نے روسی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا ہے۔ مگر وہ اس تاریخی حقیقت سے سرے سے ناواقف ہیں کہ روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی دراصل ایک دور کا خاتمہ ہے۔ یہ ویسا ہی معاملہ ہے جیسے مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی نے انگریزوں کو ہندستان سے نکلنے پر مجبور کیا۔ مگر انگریزوں کا یہاں سے نکلنا اسی کے ساتھ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اب قدیم طرز کا نوآبادیاتی دور (Colonial age) ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔

مجاہدین میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوتے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے اور وقت کی رفتار کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ روسی فوجوں کی واپسی سادہ طور پر صرف واپسی نہیں ہے، یہ اس دور کا خاتمہ ہے جس میں روسی طرز کا تدخل ممکن ہوتا تھا۔ اگر افغانی مجاہدین اس راز کو جانتے تو ان کا طرز کار بالکل بدل جاتا۔ ہتھیار کی طاقت سے انھوں نے خارجی حریف کو زیر کیا تھا، امن کی طاقت سے وہ داخلی حریف پر قابو پا لیتے۔

کابل سے انگریزی کا صرف ایک اخبار نکلتا ہے جس کا نام "کابل ٹائمس" ہے۔ البتہ فارسی (دری) میں بہت سے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اخبار انیس (۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۹) کے ایڈیٹوریل کا عنوان تھا: محمدؐ مصلح کبیر و انسان دوست بزرگ۔ اس میں مولوی عبدالشکور (خطیب مسجد جامع باغ بالا) کی ایک تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس خبر کا عنوان یہ تھا ــــــ "ما صلح را پیش کش می کنیم"۔ خبر کے مطابق انھوں نے کہا: روایت است در جنگ حدیبیہ باوجودیکہ شرایط گرانی را بالای محمدؐ قبول دارگردیدند، آنحضرت صلح را ترجیح داد۔ زیرا می دانست کہ یک طرف مشرکین از جملہ اقوام امی باشند، و طرف دیگر یاران ہمرکابش، پس صلح حدیبیہ را بہ خاطر قطع جنگ و خوں ریزی قبول دار شد۔

برادرکشی کے خاتمہ کے لئے (برائے ختم برادرکشی)، افغان مجاہدین سے صلح کی پیش کش کی مزید تفصیل مجھے امریکی میگزین ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) سے ملی۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) نے لکھا ہے کہ افغانستان میں اس وقت ۳۵ سالہ احمد شاہ مسعود کو "شیر پنج شیر" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس افغانی نوجوان نے کابل کے پالی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ پچھلے تقریباً دس سال سے وہ مجاہدین کا استاد بنا ہوا ہے۔ اس کا تعلق افغانستان

کی اسلامی جماعت سے ہے۔

ٹائم نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ نو سال کی جنگ کے بعد افغانستان کی وادی خالی بستیوں اور برباد مکانات کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت جنگ بندی یا مخلوط حکومت تک پر راضی نظر آتی ہے۔ صدر نجیب اللہ جو اس وقت مایوسی کا شکار ہیں، کیونکہ ان کا حامی روس واپس جا رہا ہے۔ حال میں انھوں نے مسعود کو یہ پیشکش کی کہ امن قائم کرنے کے بدلے وہ حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کر لیں:

{President Najibullah recently offered Massoud a choice of top government posts in exchange for peace (p.10).

ٹائم کے بیان کے مطابق، احمد شاہ مسعود نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ موجودہ حکومت کی بے دخلی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ عین وہی غلطی ہے جو اس سے پہلے سید قطب اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کر چکے ہیں۔ سید قطب کو جمال عبد الناصر نے مصر کی وزارت تعلیم کی پیشکش کی۔ مگر سید قطب کو اس سے کم کوئی چیز قبول نہ تھی کہ جمال عبد الناصر کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔ اسی طرح سید ابو الاعلیٰ مودودی کو محمد ایوب خاں نے یہ پیشکش کی کہ حکومت انھیں اعلیٰ ترین وسائل دے گی، وہ ایک انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی قائم کریں اور اس میں اپنی صلاحیتیں لگا دیں۔ مگر دوبارہ سید ابو الاعلیٰ مودودی اس سے کم کسی بات پر راضی نہ ہو سکے کہ محمد ایوب خاں کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں رہنما مصر اور پاکستان میں ممکن تعمیری کام نہ کر سکے، وہ صرف بربادی کی تاریخ چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ افغانی مجاہدین نے اگر اپنے رخ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو یقینی ہے کہ وہ بھی اس دنیا سے اس حال میں جائیں گے کہ ان کے پیچھے ایک برباد شدہ افغانستان کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔ اور اس دنیا سے بہرحال ہر ایک کو جانا ہے۔

افغانی مجاہدین کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی قربانی سے ۱۹۸۸ میں افغانستان میں اس تاریخی عمل کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچایا ہے جو ۱۹۷۳ میں ویت نام میں شروع ہوا تھا۔ ویت نام کو امریکہ نے طاقت کے ذریعہ مسخر کرنا چاہا۔ مگر ویت نامیوں کی ناقابل تسخیر مزاحمت نے امریکہ کو ۱۹۷۳ میں وہاں سے لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ سے ثابت

ہوا کہ کوئی قوم خواہ عسکری طاقت میں "سپر پاور" کا درجہ حاصل کرلے وہ محض طاقت کے بل پر کسی قوم کو زیر نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ٹھیک اسی عمل کو سوویت روس نے افغانستان میں دہرایا۔ بعض داخلی اسباب نے اس کو موقع دیا اور اس نے اپنی دیرینہ خواہش کے تحت افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ مگر یہ اقدام ان کے لئے بے حد مہنگا پڑا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں انھوں نے افغانستان سے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اب یہ بات آخری طور پر ثابت ہوگئی کہ بین اقوامی معاملات میں طاقت کو پہلا فیصلہ کن مقام حاصل نہیں۔

افغانستان کی موجودہ سیاست بے حد مخدوش ہے۔ روس اگرچہ اپنی فوجوں کو واپس بلا رہا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ افغانستان میں ایسی حکومت قائم ہو جو کمیونسٹ نواز ہو یا کم از کم اینٹی کمیونسٹ نہ ہو۔ دوسری طرف "مجاہدین" کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان میں سوویت روس کے کسی بھی اثر و نفوذ کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ امریکہ اور پاکستان اس مطالبہ کی تائید کر رہے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "مجاہدین" کی جو حکومت ہوگی وہ امریکہ نواز یا پاکستان نواز ہوگی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ "مجاہدین" کی بندوقوں کا رخ جو پہلے روسیوں کی طرف تھا، اب وہ حکمراں افغانی گروہ کی طرف ہو گیا ہے، کیونکہ ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ روسی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کا حل خوش تدبیری اور ایڈجسٹمنٹ ہے۔ مگر بظاہر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دس سال سے مجاہدین کے غیر مصالحانہ تشدد کو سارے عالم اسلام میں جس طرح گلوریفائی کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو ہیرو بنایا گیا ہے، اس کے بعد ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی ان کے لئے ہیرو کے مقام سے اترنے کے ہم معنی ہوگی۔ اور انسان کے لئے بلاشبہہ یہ مشکل ترین کام ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اگر بالفرض روسی اثر و نفوذ افغانستان سے ختم ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ عدم برداشت کا مزاج جو اس وقت روسیوں یا روس نوازوں کے خلاف کام کر رہا ہے وہی خود اپنوں کے خلاف کام کرنے لگے گا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز برداشت ہے، دوسروں کے مقابلہ میں بھی اور خود اپنوں کے مقابلہ میں بھی۔

اس سلسلہ میں لینن کی مثال بہت سبق آموز ہے۔ روس میں زار کے زوال کے بعد ۱۵ مارچ ۱۹۱۷ کو پہلی پراوژنل گورنمنٹ بنی۔ اس میں لینن کی حیثیت صرف اقلیتی ممبر کی تھی۔ اس کا وزیر اعظم شاہی خاندان کے جارجی لووف (Prince Georgy Lvov) کو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد الیگزینڈر کرنسکی (Aleksander Kerensky) کو ایک اہم وزیر کی حیثیت سے اس میں نمبر ۲ کی حیثیت حاصل تھی۔ لینن کی حیثیت یہ تھی کہ وہ بالشویک پارٹی کا ممبر تھا جو اس وقت کی اسمبلی (Soviets) میں ایک اقلیتی گروپ (تہائی کی تعداد) رکھتی تھی۔

مگر لینن نے انتہائی گہری تدبیروں کے ساتھ اولاً حریف پارٹی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد گہری تدبیروں کے ذریعہ ۷ نومبر ۱۹۱۷ کو ماسکو کی پوری حکومت اپنے قبضہ میں کر لی۔ لینن ابتداءً کنٹر پر راضی ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس کا ملک دو بڑی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ افغانی مجاہدین "کنٹر" پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں اس لئے مجھے امید نہیں کہ وہ کبھی برتر کو پانے میں کامیاب ہو سکیں گے (EB-16/68)

افغانستان میں اگر آپ افغانی مجاہدین سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین جہاد" ہے۔ اس کے برعکس کابل کے حکمراں طبقہ سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین صلح" ہے۔ بظاہر دونوں اسلام کا لفظ بول رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً دونوں کا مقصد ایک ہے۔ اسلام کو اپنی پالیسی کی تائید کے لئے استعمال کرنا۔ افغان مجاہدین کے لئے جہاد کی آیتیں مفید ہیں اس لئے وہ جہاد کی آیتوں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس حکمراں طبقہ کے لئے صلح کی آیتیں مفید مطلب ہیں اس لئے وہ صلح کی آیتوں کی تلاوت کر رہے ہیں۔

آبزرور (Observer) کے نمائندہ مسٹر آرتھر کنٹ (Arthur Kent) نے افغانستان کے اندرونی علاقوں کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں وہ قندھار گئے۔ اپنے مشاہدات کے بعد انھوں نے جو رپورٹ مرتب کی، اس کو ٹائمس آف انڈیا (۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸) نے نقل کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ افغانستان کے سرسبز علاقے اجڑے ہوئے صحرا کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ تمام بربادیوں کے باوجود افغانستان کا مستقبل غیر یقینی ہے، کیونکہ مجاہدین سات گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ افغانستان کے مستقبل کے نقشہ کے بارہ میں ان کے درمیان اتفاق نہیں۔ افغانی مجاہدین کے پاس "پولٹیکل لیڈرشپ" نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے

قندھار کے ملا نقیب اللہ سے گفتگو کی۔ آرتھر کنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کا جواب یہ تھا:

When Najib is gone, we will have a council
so that all Afghans can decide who should lead.

صدر نجیب اللہ کے چلے جانے بعد ہم ایک کونسل بنائیں گے تاکہ تمام افغانی مل کر یہ فیصلہ کریں کہ کون ملک پر حکومت کرے ——— جہاں دورِ جدوجہد میں اتحاد نہ ہو، وہاں دورِ اقتدار میں اتحاد اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے، مگر افغانی لیڈروں کو اس کی خبر نہیں۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) کی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ میں ایک بات یہ بتائی گئی ہے کہ روسیوں کے بیان کے مطابق، ان کے ۳۱۲ فوجی گم ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ روسی فوجی ہیں جن کو مجاہدین نے گرفتار کرلیا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو از خود بھاگ کر آنے والے (Defectors) ہیں۔ ان میں سے کچھ کو ٹائم کے نامہ نگار ٹی اے ڈیوس (T.A. Davis) نے خود سفر کے دوران دیکھا ہے۔ ٹائم کا بیان ہے کہ ان روسی فوجیوں میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہے جو مجاہدین کا مذہب ہے اور خود ان کے سابق باپ دادا کا بھی:

Others are converts who have embraced Islam, the religion of their captors and, for many Asian Soviets, of their parents as well (p.12).

روس کا انخلاء اگرچہ ابھی افغانستان سے مکمل نہیں ہوا ہے۔ تاہم عملی صورت حال میں اب بنیادی فرق پیدا ہو چکا ہے۔ پہلے افغانی مجاہدین کے تشدد کا نشانہ زیادہ تر روسی فوجیں بنتی تھیں۔ اب ان کے تشدد کا نشانہ خود ان کی اپنی قوم بن رہی ہے۔ پہلے وہ روسیوں کو مارتے تھے، اب وہ "روس حامی افغانیوں" کو مار رہے ہیں۔ مگر اس کو خواہ جو نام بھی دیا جائے، تاہم عملی واقعہ یہی ہے کہ پہلے اگر روس کا خاندان اپنے بیٹوں سے محروم ہو رہا تھا تو اب افغانی خاندان اپنے بیٹوں اور جوانوں سے محروم ہو رہا ہے۔ پہلے اگر روسی ٹینک تباہ ہوتے تھے، تو اب خود افغانیوں کے کھیت اور باغ اور مکان تباہ ہو رہے ہیں۔

دہلی میں جو لوگ پالم کے علاقہ میں یا اس کے قریب رہتے ہیں، ان کے لئے سر پر گھڑگھڑاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی آوازیں روزانہ کا معمول ہیں۔ کابل میں پورے شہر کا یہی حال ہے۔ ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد سے لے کر پورے زمانہ قیام تک رات دن یہ حال تھا کہ فضا میں ہوائی جہاز اڑتے

ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم دہلی اور کابل میں ایک فرق ہے۔ دہلی کی فضا میں اڑنے والے جہاز مسافر جہاز ہوتے ہیں اور کابل کی فضا میں اڑنے والے جہاز جنگی جہاز۔ ایک افغانی سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا:

You know, we are at war.

مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ لوگ جن کو باہر کی دنیا میں "مجاہدین" کہا جاتا ہے، ان کو افغانستان کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک نوجوان (۲۴ سال) کو لیا۔ ان سے میں نے ایسے موقع پر گفتگو کی جب کہ وہاں کوئی ہماری گفت گو کو سننے والا موجود نہ تھا۔ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہاں ان کو مجاہدین تو کوئی نہیں کہتا۔ البتہ یہاں کے لوگوں میں ان کے لئے عام طور پر تین الفاظ رائج ہیں:

اپوزیشن، افراطیون، اشرار

روس۔ افغانستان جنگ پر ایک معلوماتی فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو بی بی سی ٹیلیویژن پر دکھائی گئی۔ اس فلم میں افغانی فوجیوں کے مکالمات ہیں۔ اسی کے ساتھ اس میں روسی فوجیوں کے تاثرات بھی ان کی اپنی زبان میں دکھائے گئے ہیں۔ اس کے مطابق، ایک روسی جنرل نے کہا کہ مستقبل میں اگر کبھی سوویت یونین کو کوئی بین اقوامی مسئلہ طاقت کے ذریعہ حل کرنا پڑا تو وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سو بار اس پر غور کرے گا۔

روسی جنرل نے مزید کہا کہ پچھلے دس سال کی اس جنگ میں بے شمار افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ روس کے ایک اور فوجی افسر نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جنگ خالصۃً ایک سیاسی غلطی تھی، اور اس غلطی کے تمام تر ذمہ دار سابق روسی وزیر اعظم لیونڈ برژنیف ہیں ——— برژنیف اگر زندہ ہوتے تو اس سنگین حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام بڑی بڑی سیاسی غلطیاں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب کہ ان کا ارتکاب کرنے والے لیڈر مر جائیں یا وہ اقتدار کی کرسی سے ہٹ چکے ہوں۔

روانگی سے پہلے دہلی میں مجھے سرینگر کا ایک ہفتہ وار اخبار (۷ اکتوبر ۱۹۸۸) ملا۔ اس میں افغانستان سے متعلق ایک مضمون تھا۔ نصف صفحہ میں اصل مضمون تھا۔ اور بقیہ نصف میں حسب ذیل سرخی جلی حرفوں میں درج تھی:

"اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے افغان مجاہدین کی جدوجہد فیصلہ کن مرحلہ میں"

اس میں افغان نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ افغانی نوجوان ایک تختی لٹکائے ہوئے تھے جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا ـــــ قرآن زندہ باد (Long live Qur'an)

خدا کو عرب میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بنانا پڑا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے تمام اصاغر و اکابر ڈھائی دن سے بھی کم عرصہ میں اسلامی حکومت کا قلعہ کھڑا کرنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ مسلمان سیاست کے معاملہ میں اس قدر مضحکہ خیز حد تک جذباتی کیوں ہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ موجودہ لیڈروں نے تقریباً بلا استثناء یہ کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے ایک یا دوسری شکل میں سیاسی لوریاں سنائیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی حساسیت سیاست کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ جاگ اٹھی۔ ۱۹۱۲ میں جب مصطفیٰ کمال اتاترک یونانی فوجیوں کو پسپا کر کے وقتی طور پر سمرنا میں داخل ہو گئے تو برصغیر ہند میں "سمرنا بہار" آگئی۔ اشعار اور مضامین اور تقریروں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس کا خلاصہ ایک شعر میں یہ ہے:

وہ پہنچا پرچم اسلام پھر ارض سمرنا میں

مگر سمرنا کی فتح کو فتح اسلام سمجھنا جتنا بے معنی تھا، افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کو فتح اسلام سمجھنا بھی اتنا ہی بے بنیاد ہے۔ مگر اقتدار کے لئے مسلمانوں کی جوش تمنا اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ہر لکڑی پر فتح اسلام کا جھنڈا باندھ دینا چاہتے ہیں، خواہ اگلے لمحہ حالات کا طوفان اس جھنڈے کو گرا کر گہری خندق میں کیوں نہ ڈال دے۔

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ میں مختلف قوموں کے باہمی جھگڑوں کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ جھگڑے زیادہ تر سیاسی جھگڑے کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان "پختون" علاقہ کے لئے جھگڑا۔ ایران اور عراق کے درمیان شط العرب کے لئے جھگڑا۔ پاکستان اور ہندستان کے درمیان کشمیر کے لئے جھگڑا۔ وغیرہ۔ کوئی قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس کو بروقت جو کچھ حاصل ہے اس پر قانع ہو کر اپنی تعمیر کا کام کرے۔ ہر قوم اس چیز کے لئے لڑ رہی ہے جو اس کو حاصل نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر حاصل شدہ کے پیچھے دوڑنے میں حاصل شدہ بھی برباد ہو رہا ہے۔

ایک صاحب اخوانی مزاج کے تھے۔ انھوں نے انقلابی اسلام والی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم ممالک کا یہ حال ہے کہ وہاں کا حکمراں طبقہ ایک یا دوسری مغربی طاقت کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ ان مسلم حکمرانوں سے لڑ کر جب تک ان کا خاتمہ نہ کیا جائے، اسلام کو قائم اور غالب نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، بلکہ آپ کی مفروضہ تفسیر اسلام کا ہے۔ آپ لوگوں نے خود ساختہ تفسیر کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل کام اسلام کو ایک قانونی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنا ہے، اور چوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم حکمراں اس قسم کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ ان سے لڑ کر نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جائے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں حکومت پیش کی گئی مگر آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اگر اصل مقصد اقتدار ہوتا تو آپ فوراً اس کو قبول کر لیتے اور اس کے بعد ڈنڈے کے زور پر اسلامی قانون نافذ فرماتے، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض نام نہاد مجاہدین اسلام کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح قلب ہے نہ کہ اصلاح سیاست۔ سیاست کی اصلاح بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے نہ کہ وہی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔

مزید میں نے کہا کہ قرآن میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم اور دوسری طرف ارشاد ہوا ہے کہ ولا ینازعنك فی الامر وادع الیٰ ربك اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کی حکمت یہ ہے کہ اس کو کلمۂ سواء سے شروع کیا جائے نہ کہ کلمۂ نزاع سے۔ موجودہ زمانہ کے مدعیان دعوت نے اپنا کام کلمۂ نزاع سے شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار بربادی کے باوجود انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (حال مقیم واشنگٹن) نے ۱۹۶۲ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ لندن میں تھے۔ لندن یونیورسٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر پدما مسرا سے ہوئی۔ وہ ایک ہندستانی خاتون تھیں۔ جو اس وقت لندن یونیورسٹی میں تھیں۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر پدما مسرا نے ایک واقعہ بتایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ بنارس اور لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ان کے ڈبہ میں لکھنؤ کی ایک مسلمان عورت بھی تھی جو ایک سیٹ پر اپنی گٹھری رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی معمولی گھر کی ہے۔ غالباً وہ سبزی فروش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار باتھ روم گئی۔

اس کی غیر موجودگی میں ایک کھڑے ہوئے مسافر نے اس کی گٹھری ہٹادی اور جگہ بنا کر وہاں بیٹھ گیا۔ مذکورہ عورت جب باہر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی گٹھری ہٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سخت برہم ہوگئی۔ اس نے غصہ میں کہا:

نہ رہی نوابی، ورنہ تم کو زندہ دیوار میں چُنوا دیتی

یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر سعید صاحب نے کہا کہ مسلمانوں سے حکومت چلی گئی، مگر ان کا حاکمانہ مزاج اب تک ان سے نہیں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ سب ان کے اسی مزاج کی قیمت ہے۔ کوئی نعمت آدمی کو ملے تو آدمی کو اس پر شکر کرنا چاہئے، اور جب وہ چھن جائے تو صبر۔ مگر مسلمانوں نے نہ پہلے شکر کیا اور نہ اب وہ صبر کرنے پر راضی ہیں۔

کھانے کی میز پر ایک بار چھ آدمی تھے۔ ان میں سے پانچ عرب تھے۔ صرف میں غیر عرب تھا۔ ایک مصری تھے جو مسلسل بول رہے تھے۔ دوسرے لوگ متکلم کے بجائے زیادہ تر سامع بنے رہے۔ مصری صاحب مجلسی انداز کی باتیں کر رہے تھے، اور طرح طرح کے لطیفے بیان کر رہے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے اس عربی مقولہ کو دہرایا: خیر الکلام ما قل ودل (بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور مدلل ہو) اس مختصر مقولہ پر بھی انھوں نے ایک "مفصل" تقریر کر ڈالی۔

مصری کا مذکورہ مقولہ کو نقل کرنا مقولہ برائے مقولہ تھا۔ کیونکہ ان کا اپنا کلام سراسر اس سے مختلف تھا۔ یہی حال دین کے معاملہ میں بھی اکثر لوگوں کا ہے۔ وہ دین کے موضوع پر تقریر کرتے ہیں۔ مگر یہ سارا معاملہ تقریر برائے تقریر ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی مجلسی آدمی طرح طرح کی باتیں کرے، حالانکہ ان میں سے کسی بات پر بھی اس کا ایمان نہ ہو۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک یورپی ملک سے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامیات سے ایم اے کیا ہے۔ وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ حتی کہ انھوں نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا، ان سے ایک اسلامی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے نقطہ نظر سے مختلف نقطۂ نظر پیش کیا اور اس کے حق میں قرآن و حدیث سے دلیلیں دیں۔ میری بات سے ان پر استعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے یہ نہ کہہ سکے کہ آپ کا نقطۂ نظر درست ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی: مگر فلاں فلاں مشہور لوگوں نے تو

ایسا نہیں کہا۔

بیشتر لوگ کسی بات کو اس لئے مانتے ہیں کہ ان کی مسلّمہ شخصیت نے ایسا کہا ہے نہ کہ دلیل سے اس طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے اندر سچائی کبھی ذہنی انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن ہمیشہ شخصیتوں کی عظمت میں گم رہتا ہے، وہ حقائق کی عظمت میں گم ہونے کا کبھی تجربہ نہیں کرتا۔

ڈاکٹر اسکندر احمد چودھری بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ آجکل وہ ٹوکیو (جاپان) میں مقیم ہیں۔ وہاں وہ ریڈیو میں بنگالی اناؤنسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسلامک کلچر سوسائٹی جاپان کے ڈائرکٹر ہیں۔

ڈاکٹر چودھری سے جاپان کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے جاپان پر ۱۹۶۷ سے لکھنا شروع کیا جب کہ ہندستان میں جاپان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جواہر لال نہرو اس کو اپنی ناوابستگی کی پالیسی کے خلاف سمجھتے تھے کہ وہ جاپان سے تعلق قائم کریں۔ پچھلے ۲۵ سال میں میں نے جاپان پر اتنے زیادہ مضامین لکھے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک پوری کتاب بن جائے۔ میں نے کہا کہ جاپان سے میری دلچسپی کا سبب ہے "حدیبیہ" کی پالیسی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے میدان میں عالی شان طور پر استعمال فرمایا تھا، اس کو تاریخ میں دوسری بار جاپان نے سیکولر میدان میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر چودھری سے میں نے کہا کہ اس پالیسی کو جاپانیوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ گیاکوتن (Gyakuten) ہے۔ ڈاکٹر چودھری سے گفتگو کے دوران میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جاپانیوں کی خاص صفت جس کی بنا پر انھوں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے، وہ، ایک لفظ میں، حکم کی تابعداری (Submission to authority) کا مزاج ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی بڑی ترقی کے لئے یہ سب سے اہم صفت ہے۔ جاپانیوں میں یہ صفت آخری حد تک پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسر یا حاکم کی بات کو فوراً ماننے پر راضی ہو جاتے ہیں، خواہ وہ انھیں صحیح نظر آئے یا غلط۔ یہ صفت صحابۂ کرام میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ صفت انتہائی حد تک مفقود ہے۔

اور بلاشبہ ان کی موجودہ بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

میں نے ان سے مزید پوچھا کہ جاپان نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے اس کو اقتصادی معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس معجزہ کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مگر جاپانی اس کو معجزہ نہیں کہتے۔ وہ اس کو سخت محنت (Hard work) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر اس کو معجزہ کہا جائے تب بھی اس کا اصل راز ہارڈ ورک ہی ہے نہ کہ کوئی پراسرار چیز۔

ایک پاکستانی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں اور امریکہ کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں زندگی بہت پرسکون ہے۔ مگر وہاں کا سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جو ہماری نسلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے بچے وہاں کے ماحول سے اتنا زیادہ متاثر ہو رہے ہیں کہ اس بات کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری تیسری نسل مسلمان بھی باقی رہے گی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسے لوگ برابر اپنے وطن واپس جانے کو سوچتے رہتے ہیں، مگر اب وطن کا ماحول بھی اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

میں نے کہا کہ امریکہ کا مسئلہ اگر غیر اسلام ہے تو پاکستان میں کچھ لوگوں کی نادانی سے خود اسلام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ میری یہ بات انھیں عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کو زبردستی اسلامائز کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں اسلام تو نہیں آیا، البتہ لوگ اسلام سے متوحش ہو گئے۔ ایک نوجوان اگر جاہل رہ جائے اور جلد تعلیم یافتہ بنانے کے شوق میں آپ اس کو مار مار کر پڑھانا شروع کر دیں تو وہ تعلیم یافتہ تو نہیں بنے گا، البتہ تعلیم سے متنفر ہو جائے گا۔ یہی صورت پاکستان کے ساتھ پیش آئی ہے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ یہ ہدایت دی تھی کہ میرے بعد مسلم حکمرانوں سے نہ لڑنا، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ تم دیکھو کہ ان میں بگاڑ آگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا مقصود کوششوں کو روکنا نہیں بلکہ کوششوں کو ڈائورٹ (Divert) کرنا تھا۔ یہی کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اور اسلام کی تاریخ میں اس کی انتہائی روشن مثال محدثین کا طبقہ ہے۔ محدثین کے زمانہ میں حکمرانوں میں بہت بگاڑ آچکا تھا، مگر انھوں نے حکمرانوں سے ٹکرانے کے بجائے اپنے آپ کو حدیث کی خدمت میں لگا دیا۔ اس کے نتیجہ میں حدیث کی جمع و تدوین کا وہ عظیم الشان کام انجام پایا جس کی

اہمیت قیامت تک ختم ہونے والی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ سوسائٹی سے سسٹم بنتا ہے۔ سسٹم سے سوسائٹی نہیں بنتی۔ پاکستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کی سوسائٹی اسلام کے نظام قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسی حالت میں پہلا کام یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر اس کی استعداد پیدا کی جائے۔ یہ کام صرف تذکیر و نصیحت کے ذریعہ انجام پاتا ہے نہ کہ کوڑا مارنے اور سزائیں جاری کرنے سے۔ یہ گفتگو ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہوئی۔

ہم لوگ ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک نیچی میز تھی جس کے اوپر لکڑی کے تختہ کے بجائے سفید ماربل سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہ سنگ مرمر افغانستان کی خاص چیز ہے۔ اور جب لاہور میں اقبال کا مقبرہ بن رہا تھا تو اس وقت کے افغانی حکمراں نے اس میں لگانے کے لئے افغانی سنگ مرمر بطور ہدیہ روانہ کیا تھا۔

ایک صاحب اقبال کے فارسی کلام سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ اگر اقبال نہ ہوتے تو موجودہ مسلمان بے حوصلہ ہو کر رہ جاتے۔ میں نے کہا کہ اقبال نے شاعرانہ ترنم تو قوم کو ضرور دیا۔ مگر جہاں تک حوصلہ کا تعلق ہے، ان کے کلام نے برعکس کام کیا ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے سلطان ٹیپو کے بارہ میں کہا کہ وہ ہماری ترکش کا آخری تیر تھا:

ترکش ما را خدنگ آخریں

اس شعر کی روشنی میں دیکھئے تو سلطان ٹیپو کی شکست (بالفاظ دیگر، مسلمانوں کی عسکری قوت کی بربادی) کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے پاس گویا کچھ نہیں رہا۔ یہ تصور کتنی زبردست پست حوصلگی پیدا کرتا ہے۔ انھوں کہا کہ پھر آپ کے خیال میں اقبال کو کیا کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ اقبال کو کہنا چاہئے تھا کہ ٹیپو کی عسکری طاقت ختم ہو گئی تو غم کی بات نہیں۔ اسلام کی دعوتی طاقت زندہ ہے۔ تم اسلامی دعوت کو لے کر اٹھو۔ اور اس کے ذریعہ سے دنیا کو مسخر کرو۔ اقبال اگر یہ بات کہتے تو اس سے مسلمانوں کو رہنمائی ملتی۔ مگر ٹیپو کو "آخری تیر" کہہ کر انھوں نے مسلمانوں کو بے حوصلگی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ ان کی تعلیم پاکستان کے ایک دار العلوم میں ہوئی ہے اور اچھی اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ برابر پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے پاکستان کے ایک واقف کار کے ذریعہ

مل جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ صاحب پورے رسالہ کی فوٹو کاپی کرکے مجھے روانہ کر دیتے ہیں۔

انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اکتوبر ۱۹۸۸ کے الرسالہ میں زمین سے محروم (صفحہ ۳) کے عنوان سے جنرل ضیاء الحق مرحوم پر جو مضمون ہے وہ لاجواب ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنرل ضیاء کی موت پر مسلم دنیا کے تقریباً ہر اخبار اور ہر رسالہ نے مضامین شائع کئے ہیں اور ہر رہنما نے اپنے بیانات دئے ہیں، مگر آپ کا مضمون ان سب میں منفرد تھا۔ دوسرے لوگوں نے عام طور پر صرف ضیاء کی تعریف کی ہے۔ ان کو ہیرو بنایا ہے۔ مگر آپ نے اس سے سبق کا پہلو نکالا ہے۔ اور مومن کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ سے عبرت اور نصیحت لے سکے۔

انھوں نے کہا کہ امت پر اس قسم کا سب سے بڑا واقعہ وہ تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام نے ایسا نہیں کیا کہ ہر ایک آپ کی شان میں تعریفی تقریر کرنے لگے اور آپ کو "شہید" یا اسلامی ہیرو ثابت کرنے میں تمام الفاظ صرف کر ڈالے۔ اس کے برعکس انھوں نے اس واقعہ سے موت اور آخرت کی یاد حاصل کی۔ حضرت ابوبکر تشریف لائے اور آپ کی میت کو دیکھا تو قرآن کی یہ آیت پڑھی: کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ اسی طرح حضرت عباس نے فرمایا: واللہ الذی لا الہ الا ھو لقد ذاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الموت۔

مذکورہ عالم نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں الرسالہ سنت رسول اللہ کو زندہ کر رہا ہے۔ لوگوں کو قومی دین سے نکال کر خداوندی دین پر لا رہا ہے۔ اس وقت اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔

کمرہ کی جو میز تھی، اس کے سامنے ملا ہوا بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس دوران آئینہ کی طرف نظر گئی تو دکھائی دیا کہ قلم میرے بائیں ہاتھ میں ہے، حالانکہ میں اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ اسی طرح گھڑی دائیں ہاتھ میں دکھائی دی، حالانکہ وہ میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔

ایسا اس لئے تھا کہ آئینہ میں آدمی کی تصویر الٹ جاتی ہے۔ یعنی دایاں رخ بائیں طرف اور بایاں رخ دائیں طرف ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو خارجی دنیا کو اپنے فٹ کئے ہوئے شیشہ میں دیکھیں۔ ان کے اپنے مشاہدہ میں ہر چیز الٹی ہوگی اور وہ ان کو الٹی صورت میں بیان کریں گے۔ بظاہر وہ اپنے بیان میں مخلص ہوں گے۔ مگر مخلص ہونے کا لازمی مطلب یہ نہیں

ہے کہ آدمی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ واقعہ کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ ایک چیز باعتبار مشاہدہ کچھ اور ہوتی ہے اور باعتبار واقعہ کچھ اور۔

فجر کی اذان کی آواز آئی۔ گھڑی دیکھی تو ہندستانی وقت کے لحاظ سے گھڑی میں چھ بج رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ دہلی میں آجکل فجر کی اذان تقریباً پانچ بجے ہوتی ہے۔ افغانستان کا وقت، ہندستان کے مقابلہ میں ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندستان "آگے" ہے اور افغانستان اس سے "پیچھے" یہ صرف ایک جغرافی تقسیم کا معاملہ ہے نہ کہ سابق اور مسبوق کا معاملہ۔

نماز میں امام کو آگے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی شخصیت برتر ہے اور دوسرے نمازیوں کی کم تر۔ یہ قیام جماعت کے لئے ایک انتظامی تقسیم ہے۔ کبھی فرق باعتبار جوہر ہوتا ہے اور کبھی فرق باعتبار انتظام۔ جو لوگ جوہری تقسیم اور انتظامی تقسیم کے اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ ایک عظیم الشان غلطی کرتے ہیں۔ جس فرق کو اللہ تعالیٰ نے برائے انتظام رکھا تھا، اس کو افضلیت اور غیر افضلیت کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر دین میں زبردست خرابی پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

۲۵ اکتوبر کو میں نے واپسی کا پروگرام بنایا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے پیغام ملا کہ ۲۵ اکتوبر کی شام کو ڈاکٹر نجیب اللہ (پریسیڈنٹ افغانستان) شرکاء کانفرنس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا نام لے کر خاص طور پر انھوں نے کہا کہ ان سے ملنا بھی ضروری ہے۔ یہ ملاقات یہاں کے صدارتی محل میں ہونے والی تھی۔ میں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ۲۵ اکتوبر کی فلائٹ چھوڑ دوں تو اس کے بعد اگلی فلائٹ مجھے ۲۷ اکتوبر کو ملے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ عذر پریسیڈنٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی فکر نہ کیجئے ۲۶ اکتوبر کو انھیں اسپیشل فلائٹ کے ذریعہ دہلی پہنچا دیا جائے گا۔ مگر اپنے ضروری پروگرام کے تحت میرے لئے مزید ٹھہرنے کا موقع نہ تھا، چنانچہ میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۸ کو دہلی واپس آگیا۔

۲۵ اکتوبر کو مجھے انڈین ایئر لائنز سے واپس آنا تھا۔ مگر اس روز کی فلائٹ سے ہماری سیٹ کنفرم نہ تھی۔ میں اور میرے ساتھی دونوں ویٹنگ لسٹ پر تھے۔ ایئر پورٹ پہنچے تو کاؤنٹر پر بتایا گیا کہ تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب اس جہاز سے سفر کی کوئی گنجائش نہیں۔

اتنے میں انڈین ایئر لائنز کے منیجر کسی وجہ سے وی آئی پی لاؤنج میں آگئے جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے

تھے۔ میں فوراً ان سے ملا اور کہا کہ کل مجھے روم جانا ہے، اس لئے آج میرا دہلی پہنچنا ضروری ہے۔ اگر آپ اس جہاز سے ہمیں بھیج دیں تو آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اچھا، میں تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے آفس میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد ایک کلرک آیا۔ اس نے ہم دونوں آدمیوں کا ٹکٹ اور پاسپورٹ مانگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مذکورہ کلرک دوبارہ آیا اور ٹکٹ اور پاسپورٹ کے ساتھ ہمارا بورڈنگ کارڈ بھی ہمارے حوالہ کر دیا۔

انڈین ایئر لائنز کے منیجر جنھوں نے بالکل آخر وقت میں ہمارا یہ کام کیا ان کا نام مسٹر اودے کمار شرما تھا۔ اس کے بعد جب میں ہوائی جہاز میں داخل ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو میرا دل کہہ رہا تھا ـــــ اگر آدمی اپنے کیس کو جینوئن کیس ثابت کر سکے تو ہر شخص اس کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، خواہ اس کے نام اودے کمار شرما ہو یا محمد اسلام الدین۔

اطلاع

ماہ فروری میں انگریزی الرسالہ کے بارہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مسلسل خسارہ کی وجہ سے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب قارئین کے اصرار اور خواہش کی بنا پر فوری طور پر اس کو بند کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا ہے، تاہم انگریزی الرسالہ کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے اہلِ خیر حضرات کا کافی تعاون درکار ہے تاکہ خسارہ کی تلافی کر کے اس کو جاری رکھا جا سکے۔ امید ہے کہ اہلِ خیر حضرات اس دعوتی کام میں فیاضانہ تعاون فرمائیں گے۔

صدر اسلامی مرکز

۱۔ ایسوسی ایشن فار ہیومن ایفرس (نئی دہلی) تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک تنظیم ہے جس کے صدر ڈاکٹر مکند دویدی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر بھرت کمار ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے ایک مہم شروع کر رہی ہے جس کے تحت مختلف حلقوں سے ایک لاکھ ایسے لوگوں کے دستخط حاصل کیے جائیں گے جو یہ عہد کریں کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے خلاف کسی قسم کا کوئی کام نہیں کریں گے۔ اس عہدنامہ سے پہلے اس کے لیے ایک اپیل دس ہزار کی تعداد میں چھاپ کر پھیلائی جائے گی جس پر پچاس ممتاز اہلِ علم (Eminent academicians) کے نام ہوں گے۔ مذکورہ تنظیم نے اس اپیل میں صدر اسلامی مرکز کا نام شامل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، انھیں اس کی اجازت دیدی گئی۔

۲۔ ہندی زبان میں اب تک مرکز کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انسان اپنے آپ کو پہچان، اور ستیہ کی کھوج۔ اب تیسری کتاب کا ہندی ترجمہ تیار ہو چکا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد چھپ جائے گا۔ یہ وہی باب ہے جو پیغمبر انقلاب میں "مثالی کردار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ الرسالہ کا پیغام خدا کے فضل سے مختلف طریقوں سے عوام تک پہنچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر آنند (گجرات) کے کچھ لوگوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ الرسالہ کے مختصر مختصر اقتباس کو گجراتی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اور پھر ہر جمعہ کو ایک اقتباس آنند کی جامع مسجد کے بلیک بورڈ پر لکھ دیتے ہیں۔ گجراتی لوگ اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

۴۔ تذکیر القرآن کی مقبولیت خدا کے فضل سے تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ حیدرآباد کے ایک صاحب خیر نے تذکیر القرآن کے ایک سو سٹ حاصل کیے ہیں تاکہ ان کو لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ امریکہ کے کچھ لوگوں نے فرمائش کی ہے کہ پوری تذکیر القرآن ٹیپ پر منتقل کر کے انھیں فراہم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جدید طرز کا ایک خصوصی ریکارڈر اور اس کا ضروری سامان بطور عطیہ مرکز کو دیا ہے تاکہ ریکارڈنگ کا کام بآسانی

انجام دیا جاسکے۔

۵۔ ولی محمد انصاری صاحب (دھولیہ) نے اپنے خط مورخہ ۲۳ نومبر میں اطلاع دی ہے کہ انگریزی کتاب گاڈ ارائزز کا مراٹھی ترجمہ مکمل ہوچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ترجمہ مزید تکمیلی مراحل سے گزر کر اشاعت پذیر ہوسکے۔

۶۔ پٹنہ میں ۱۴ سے ۲۳ نومبر ۱۹۸۸ تک کتابوں کی نمائش تھی۔ اس موقع پر محمد صلیح صاحب نے اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال لگایا۔ کافی تعداد میں لوگوں نے آکر دیکھا اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ کئی لوگوں نے الرسالہ کی خریداری قبول کی۔ کتابیں بھی بڑی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ ہندی کتابیں سب کی سب ختم ہوگئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ "الرسالہ امریکی ڈالر کی طرح ہے۔ اس کی ویلو ختم ہونے والی نہیں۔ ہر جگہ اس کی قیمت ہے۔ ہر جگہ اس کے طلب گار موجود ہیں"۔

۷۔ عربی پریس میں مختلف انداز سے اسلامی مرکز کا تذکرہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر قاہرہ کے اخوانی ماہنامہ "المختار الاسلامی" نے اپنے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۸ (ربیع الاول ۱۴۰۹) میں پیغمبر انقلاب (انگریزی) کا تعارف شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے: محمد نبی الثورۃ۔ یہ تعارف ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے: صدر حدیثا للمفکر الاسلامی المعروف وحید الدین خان کتاب جدید باللغۃ الانجلیزیۃ عن المرکز الاسلامی بالھند یقدم فیہ اسھاما جدیدا فی دراسۃ شخصیۃ الرسول الکریم۔

۸۔ مختلف مقامات سے کثرت سے رپورٹ ملی ہے کہ جو لوگ اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں پڑھاتے ہیں وہ بچوں کے خارجی مطالعہ کے لیے الرسالہ انگریزی کو پسند کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس میں انھیں یہ موقع ملتا ہے کہ اچھی انگریزی زبان میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرسکیں۔ ہر جگہ الرسالہ کے احباب کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں تک الرسالہ انگریزی کو پہنچانے کا انتظام کریں جن کے بچے انگلش اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ الرسالہ انگریزی ایسے لوگوں کے لیے قیمتی اسلامی تحفہ ہے۔

۹۔ خلیجی ملکوں میں الرسالہ اردو، انگریزی بڑی تعداد میں جاتے ہیں۔ نیز دوسرے مختلف طریقوں سے بھی اس کا پیغام پھیل رہا ہے۔ مثلاً شکیل احمد صاحب انجینیر ایک عرب ملک میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بارہ صفحات کا ایک کتابچہ بھیجا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ الرسالہ کے پیغام کو نئے نئے طریقہ سے پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے سائز پر یہ پمفلٹ تیار کیا ہے۔ اس میں الرسالہ کے صفحہ اول پر شائع ہونے والے چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ ہر صفحہ پر تین مضمون جلی حرفوں میں درج ہے۔ یہ پمفلٹ فوٹو کاپی کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح کے کتابچے تیار کر کے انھوں نے اپنے حلقہ میں لوگوں کے درمیان تقسیم کیے ہیں۔

۱۰۔ آزاد کتاب گھر (جمشید پور) نے اطلاع دی ہے کہ ۱۲ نومبر سے ۲۶ نومبر ۱۹۸۸ تک ٹاٹا کمپنی کے تعاون سے رابندر بھون جمشید پور میں بک فیر ہوئی جس میں ان کا واحد اردو کتابوں کا اسٹال تھا۔ اس موقع پر انھوں نے اسلامی مرکز کی اردو اور انگریزی کتابیں بک فیر میں رکھیں جن کو مسلم اور غیر مسلم دونوں نے بڑے اشتیاق اور دل چسپی سے مطالعہ کیا اور کتابیں حاصل کیں۔ لوگوں کی طرف سے کافی مانگ تھی۔

۱۱۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے اخبارات و رسائل ہیں جو برابر الرسالہ کے مضامین نقل کرتے ہیں۔ مثلاً بمبئی کا نقش کوکن، بنگلور کا سالار، لاہور کا وفاق، لاہور کا اشراق، بمبئی کا اردو ٹائمز، وغیرہ۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام مختلف حلقوں میں مسلسل پہنچ رہا ہے۔

۱۲۔ لیسٹر (انگلینڈ) سے ایک سہ ماہی مجلہ شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے :

Index of Islamic literature

یہ مجلہ ورلڈ کونسل فار اسلامک ریسرچ (لکسمبرگ) کے تعاون سے شائع ہوتا ہے اور اس میں انگریزی زبان میں شائع ہونے والے لٹریچر کی فہرست دی جاتی ہے۔ اس مجلہ کی جلد ۹ نمبر ۲ (۱۹۸۹) میں صفحہ ۷ پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتاب گاڈ ارائزز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مجلہ ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ انگلینڈ میں چھاپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثنائی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 March 1989 No. 148

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳